OUR ENDANGERED VALUES
America's Moral Crisis

امریکہ کا اخلاقی بحران

مصنف

جمی کارٹر

(سابق امریکی صدر)

مترجم

محمد احسن بٹ

DAR - UL - SHAOR

Marfat.com

5423

OUR ENDANGERED VALUES
America's Moral Crisis

امریکہ کا اخلاقی بحران

مصنف

جمی کارٹر

(سابق: امریکی صدر)

مترجم

محمد احسن بٹ

DAR - UL - SHAOR

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	⇐	امریکہ کا اخلاقی بحران
مصنف	⇐	جمی کارٹر
مترجم	⇐	محمد احسن بٹ
اشاعت	⇐	اپریل 2006ء
کمپوزنگ	⇐	طاہر مقصود
مطبع	⇐	علی فرید پرنٹرز لاہور
برائے	⇐	
دارالشعور		37۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور
قیمت	⇐	-/160 روپے

اہتمام: محمد عباس شاد

81661

E-mail: m_d7868@yahoo.com
Ph: 042-7239138,8460196
Mob:0300-9426395,0321-9426395

Marfat.com

انتساب

اپنے بچوں، پوتے، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں کے
نام، کہ جن کے لیے امریکہ کی بنیادی اخلاقی اقدار کو
محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

جمی کارٹر

ذخیرہ
Marfat.com

Marfat.com

فہرست

	امریکہ کا اخلاقی بحران	7
	عرضِ مترجم	13
	تعارف	15
	عرضِ مصنف	17
پہلا باب :	امریکیوں کے مشترک اعتقادات اور سنگین اقدامات	23
دوسرا باب :	میرا روایتی عیسائی عقیدہ	31
تیسرا باب :	مذہبی بنیاد پرستی کا ابھار	43
چوتھا باب :	مذہبی لوگوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازعات	47
پانچواں باب :	سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے	57
چھٹا باب :	چرچ اور ریاست کا اختلاط	62
ساتواں باب :	طلاق اور ہم جنس پرستی کے گناہ	72
آٹھواں باب :	کیا یسوع مسیح اسقاطِ حمل اور سزائے موت کی منظوری دیتے؟	77
نواں باب :	کیا عورتوں کو لازماً محکوم ہونا چاہیے؟	90
دسواں باب :	بنیاد پرستی حکومت میں	96
گیارہواں باب :	مسخ شدہ امریکی خارجہ پالیسی	103
بارہواں باب :	حقوقِ انسانی پر نہیں دہشت گردی پر حملہ؟	114
تیرھواں باب :	ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ اور امریکہ کی ذمہ داری	128
چودھواں باب :	پیش بندی کے طور پر کی جانے والی جنگ	138
پندرہواں باب :	امریکہ کی ماحولیات دشمنی	153
سولہواں باب :	نئی ہزاری میں دنیا کا سب سے بڑا چیلنج	165
	سپر پاور کسے کہتے ہیں	182

Marfat.com

Marfat.com

''امریکہ کا اخلاقی بحران''

''امریکہ کا اخلاقی بحران'' سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی تازہ ترین کتاب Our Endangered Values: America's Moral Crisis کا ترجمہ ہے۔

یہ ترجمہ محمد احسن بٹ نے کیا ہے، جو اس سے پہلے برنارڈ لیوس، نوام چومسکی، سیموئیل پی ہنٹنگٹن، کیرن آرمسٹرانگ، خوش ونت سنگھ، رمزے کلارک، جے۔ اے۔ کڈن اور بھارتی صدر عبدالکلام کے علاوہ کئی معروف مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی سے اُردو میں تراجم کر کے اس شعبۂ ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں۔ جمی کارٹر امریکہ میں بنیاد پرست کہلوانے والے عیسائی فرقے ''جنوبی بیپٹسٹ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے دوسرے باب ''میرا روایتی عیسائی عقیدہ'' میں تفصیل سے اپنی مذہبی تربیت اور زندگی بھر کے معمولات و معاملات میں عیسائی مذہبی اقدار کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ وہ امریکہ اور دنیا بھر میں ایک مذہبی ذہن رکھنے والے سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ عیسائی مذہب کی اقدار غیر متبدل ہیں۔ وہ ان اقدار کو تبلیغ کے ذریعے پوری دنیا میں رائج کرنے کی کوششوں کو مذہبی فریضہ مانتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنی صدارت کے زمانے میں بھی باقاعدگی سے چرچ جا کر عبادت کرتے تھے اور انجیل کے درس دیا کرتے تھے، جو کہ ان کا زندگی بھر کا معمول رہا ہے۔ وہ اس کتاب سے پہلے 19 کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں سے بیشتر مذہبی (عیسائی) نکتۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی انہوں نے مذہبی نکتۂ نگاہ سے امریکہ کی موجودہ استحصالی، غیر جمہوری، آمرانہ، انسان دشمن اور ہر اخلاقی و قانونی ضابطے کو توڑنے والی داخلہ و خارجہ پالیسیوں کا تجزیہ کیا ہے، جس کو پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ دنیا پر مطلق حکمرانی کے خواب

Marfat.com

دیکھنے والے موجودہ امریکی حکمران اور اسٹیبلشمنٹ اخلاقی اعتبار سے کتنے سنگین بحران کا شکار ہیں۔ انسانی روایات و اقدار کو روندنے والے امریکی حکمران چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کی قومیں اپنے صدیوں پرانے دانش و بصیرت کے ورثے کو چھوڑ کر صرف اور صرف امریکی سرمایہ دار طبقے کے ایجنٹ کے طور پر کام کریں۔

جمی کارٹر نے موجودہ امریکی حکومت کے رویّوں کا تجزیہ کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے کہ وائٹ ہاؤس، کانگرس اور سینیٹ۔ بڑی امریکی تجارتی کمپنیوں، صنعت کاروں، دولت مند کاشت کاروں اور بنیاد پرست عیسائیوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے امریکی اور انسانی تاریخی روایات و اقدار کو پامال کر رہے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان طبقوں کے لابی کار (Lobbyists) اپنے مقاصد کے حصول کے لیے واشنگٹن کے فیصلہ سازوں اور پالیسیاں بنانے والوں کو بھاری رقوم بطور رشوت دے رہے ہیں۔

جمی کارٹر نے کتاب کو 17 ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب میں نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا اور نوعِ انسان پر اثر انداز ہونے والے معاملات کے حوالے سے موجودہ امریکی حکمرانوں کے غیر اخلاقی رویے کو عیاں کیا ہے۔

ساری دنیا کے ملکوں کو اپنے سیاسی نظام میں استحکام لانے کے لیے مجبور کرنے والے امریکہ کی داخلی صورتِ حال جمی کارٹر کے الفاظ میں یہ ہے، ''ڈیموکریٹ اور ری پبلکن سیاست دانوں کی اکثریت اس امر سے متفق ہے کہ اس وقت ہمارا ملک سیاسی اعتبار سے تاریخ کی سب سے بڑی تقسیم کا شکار ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کی عکاسی کسی حد تک 2000ء کے مشکوک صدارتی انتخابات سے ہو چکی ہے۔'' آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ امریکی ریاستوں میں بھی نفرت و عداوت بڑھ رہی ہے اور ''نیلی'' اور ''سرخ'' ریاستوں کی اصطلاح کا بڑھتا ہوا استعمال اس کا عکاس ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ داخلی انتظامی حوالے سے شدید بحران کا شکار ہے اور کسی بڑے مسئلے پر امریکی ریاستوں کی باہمی نفرت ماضی کی طرح کوئی خطرناک روپ دھار سکتی ہے۔ یہ نہ صرف برِاعظم شمالی امریکہ بلکہ ساری دنیا کے لیے ایک تشویش انگیز مسئلہ ہے۔ یہاں

Marfat.com

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جمی کارٹر نے جانبداری سے کام لیتے ہوئے اس مسئلے کی سنگینی کو تفصیل سے بیان نہیں کیا بہرحال عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

عالمی تنازعوں کو پُرامن مذاکرات کی بجائے جنگ کے ذریعے حل کرنے کی جارحانہ امریکی پالیسی کا تجزیہ کرتے ہوئے جمی کارٹر نے لکھا ہے کہ ''اس وقت حکومت بنیاد پرست عیسائیوں اور مخصوص سرمایہ دار طبقوں کے زیرِ اثر تمام اقدامات کر رہی ہے۔ ان کے بقول بنیاد پرست عیسائی دنیا کے جلد اختتام کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے جنگجویانہ اور جارحانہ پالیسیاں بنوا رہے ہیں۔ جمی کارٹر لکھتے ہیں کہ دنیا کے اختتام کے حوالے سے انجیلی پیش گوئیوں پر مبنی ایک کتابی سلسلے نے امریکہ میں فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس عقیدے کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ آخری زمانے میں جب دنیا کا اختتام قریب ہوگا تو خداوند اپنے پسندیدہ اور منتخب انسانوں کو آسمان پر اٹھالے گا، جو وہاں سے باقی ساری نوعِ انسان کی ہلاکت و بربادی کا نظارہ کریں گے۔ عیسائی بنیاد پرستوں کا ایک اور عقیدہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے اختتام سے پہلے مشرقِ وسطیٰ کے خطے میں ہولناک جنگیں ہوں گی۔ چنانچہ وہ اس اَمر کے لیے بالخصوص کوشاں ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے امریکی پالیسیوں میں جنگ کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل رہے۔ یہ عالمی امن، بھائی چارے، عدم تشدد اور نوعِ انسان کی فلاح و بقا کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کے لیے انتہائی فکر انگیز معاملہ ہے۔''

امریکہ کے داخلی سماجی مسائل اور ان کے حوالے سے امریکیوں میں پیدا ہونے والی تفریق و تقسیم کے تناظر میں جمی کارٹر نے لکھا ہے کہ امریکی عوام اسقاطِ حمل، ممنوعہ اسلحے پر پابندی، ماحولیات کے تحفظ وغیرہ جیسے مسائل پر بدترین اختلافات کا شکار ہیں۔ بنیاد پرست عیسائی ہر سماجی مسئلے کو اپنے خاص عیسائی عقیدے کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اختلاف کرنے والوں کو تشدد کے ذریعے دبانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

جہاں تک ممنوعہ اسلحے سے ہونے والی قتل و غارت گری کا تعلق ہے تو جمی کارٹر کے بیان کردہ اعداد و شمار ناقابلِ یقین، حیران کن اور دہشت زدہ کر دینے والے ہیں۔ انہوں نے دو مؤقر امریکی تنظیموں کے حوالے سے بتایا ہے کہ ''35 زیادہ آمدنی

Marfat.com

والے ملکوں میں ہونے والے مجموعی قتلوں سے 19 گنا زیادہ قتل امریکہ میں ہوتے ہیں۔ 2005ء میں ہینڈگنوں سے آسٹریلیا میں 334، برطانیہ میں 197 سویڈن میں 183، جاپان میں 83، آئرلینڈ میں 54، کینیڈا میں 1034 افراد کو قتل کیا گیا جبکہ اسی سال امریکہ میں 30419 افراد کو ہینڈگنوں سے قتل کیا گیا۔''

جمی کارٹر نے لکھا ہے کہ امریکہ مغرب کا واحد ملک ہے جہاں سزائے موت ابھی تک رائج ہے۔ حتیٰ کہ بچوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ البتہ سفید فام اور امیر قاتلوں کو تعداد میں غریب اور سیاہ فام قاتلوں کے مقابلے میں کم سزائے موت دی جاتی ہے۔ انہوں نے اس پر شدید تنقید کرتے ہوئے اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ جن ملکوں اور جن امریکہ ریاستوں میں سزائے موت رائج نہیں ہے وہاں جرائم کی شرح کم ہے۔ انہوں نے سوال اٹھایا ہے کہ اگر یسوع مسیح ہوتے تو کیا وہ سزائے موت کو درست قرار دیتے؟

امریکہ کے 13 سے 19 سال کے (ٹین ایج) لڑکے لڑکیوں میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کے حوالے سے انہوں نے عبرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں، ''نیویارک ٹائمز کے ایک آرٹیکل میں انکشاف کیا گیا ہے کہ کینیڈا اور یورپی ملکوں کے نوجوان بھی امریکی نوجوانوں ہی کی طرح جنسی طور پر فعال ہیں لیکن سیکس ایجوکیشن سے محروم امریکی لڑکیاں فرانسیسی لڑکیوں کے مقابلے میں سات گنا زیادہ تعداد میں ایک بچے کی ماں ہیں، سات گنا زیادہ نے ایک مرتبہ اسقاطِ حمل کرایا ہوا ہے اور ستر گنا زیادہ لڑکیاں سوزاک کا شکار ہو چکی ہیں۔''

غربت کو نئی ہزاری کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیتے ہوئے جمی کارٹر نے لکھا ہے کہ امریکہ غریبوں کو دنیا کا سب سے کم امداد دینے والا ملک ہے۔ انہوں نے امریکیوں کو شرم دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہماری سالانہ فی کس آمدنی 55000 ڈالر ہے اور ''ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے آدھے سے زیادہ لوگ دو ڈالر روزانہ سے کم پر گزر بسر کر رہے ہیں جبکہ ایک ارب بیس کروڑ لوگوں کو صرف ایک ڈالر روزانہ پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے مزید انکشاف کیا، ''ہماری خام قومی آمدنی (GNI)

Marfat.com

تقریباً 11 کھرب ڈالر ہے، جس میں سے ہم غریب ملکوں کو ہر 100 ڈالر میں سے صرف 16 سینٹ دیتے ہیں۔ اگر ہم تمام امریکی فاؤنڈیشنوں اور دوسرے نجی ذرائع سے دی جانے والی رقوم کو حکومت کے فنڈز میں شامل کرلیں تب بھی ہم اپنی قومی آمدنی کے ہر 100 ڈالر میں سے صرف 22 سینٹ غریبوں کو دیتے ہیں۔''

امریکہ کی داخلی معاشی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ وائٹ ہاؤس صرف سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے والی پالیسیاں بنا رہا ہے۔ ٹیکس میں چھوٹ دی جاتی ہے تو صرف سرمایہ داروں کو، زرعی رعایتیں دی جاتی ہیں تو صرف امیر کاشت کاروں کو، لیکن ورکنگ کلاس سے تعلق رکھنے والوں کے حالات بہتر بنانے پر بالکل توجہ نہیں دی جارہی۔ اس حوالے سے انہوں نے لکھا ہے، ''محنت کش امریکیوں کے لیے تشویش کا اظہار کرنے والے واشنگٹن کے کلیدی اہمیت کے سیاسی لیڈروں نے کم سے کم اُجرت میں اضافہ روک رکھا ہے۔ آٹھ سال سے صرف 5.15 ڈالر فی گھنٹہ اُجرت دی جارہی ہے اور اس میں افراطِ زر کے حساب سے بھی اضافہ نہیں کیا گیا۔''

انہوں نے دوسرے مغربی ملکوں میں دی جانے والی کم سے کم اُجرت سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے، ''آسٹریلیا میں کم سے کم اُجرت 8.66 ڈالر، فرانس میں 8.88 ڈالر، اٹلی میں 9.18 ڈالر، برطانیہ میں 9.20 ڈالر اور جرمنی میں 12.74 ڈالر فی گھنٹہ ہے۔''

اس کتاب کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ امریکی حکومت بنیاد پرست عیسائیوں، نیوکنزرویٹوز اور سرمایہ داروں کے اشاروں پر چل رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں اَمن اور جمہوریت کے نام پر آمریت اور دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی امریکی جنگیں امریکہ کے سرمایہ دار طبقات کے مفادات کے لیے لڑی جا رہی ہیں۔ یہ اَمر باقی دنیا کے اَمن پسند معاشروں کے لیے انتہائی تشویش انگیز ہے جو انسانی برابری، وقار، آزادی، ترقی، جمہوریت اور امن کے خواہش مند ہیں۔

محمد عباس شاد
20 مارچ 2006ء

Marfat.com

Marfat.com

عرض مترجم

کسی ملک کے سابق صدر کا اپنے ملک کے اخلاقی زوال کی گواہی دینا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ''امریکہ کا اخلاقی بحران'' ایسی ہی ایک گواہی ہے، جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے کاغذ پر ہی تحریر نہیں کی بلکہ جریدۂ عالم پر ثبت کر دی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایسے دانش مند سیاسی رہنما میسر ہیں، جو اپنے ملک کی سیاسی پیشرفت کے ہر مرحلے پر اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے شخصیات پر نہیں بلکہ پالیسیوں پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں اور اصلاح و بہتری کی راہیں دکھاتے ہیں۔

انسانی تہذیبوں کا سرسری مطالعہ کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ حکمران طبقے کی طرف سے اخلاقی اقدار کو پامال کرنے کا مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان۔ قبائلی سرداروں اور بیشتر بادشاہوں کی ذات میں ایک دانا انسان بھی موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ اپنی تمام تر سفاکی کے باوجود ان کی رعایا نے، اور بالخصوص شاعروں، ادیبوں، فلسفیوں نے ان پر اقدار کی پامالی کا الزام کم کم ہی لگایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صرف سکندر ہی فلسفی یا فلسفے کا طالبِ علم نہیں تھا بلکہ چنگیز خان جیسے بدنام حکمران بھی اپنی ذات میں کسی فلسفی سے کم نہیں تھے۔ تاہم جدید صنعتی سرمایہ دارانہ دور کے آغاز سے نظمِ حکومت بھی بدلا۔ ''سیاست دان'' کہلانے والوں کا نیا طبقہ انسانوں میں پیدا ہوا۔ حکومتی امور کو تقسیم کیا گیا۔ بیوروکریسی وجود میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی حکمران کی ذات میں سے فلسفیانہ عنصر بھی ختم ہو گیا۔ دورِ جدید میں حکمران کی خصوصیات میں اس کا عالم، فلسفی، شاعر یا سائنس دان ہونا شامل نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو عملاً حکمرانی کے قابل نہیں سمجھا جاتا جو مذکورہ بالا درجہ بندیوں میں سے کسی میں شمار ہوتے ہوں۔ میرے خیال میں نوعِ انسان کا سب سے اہم عصری مسئلہ یہی ہے۔ جمی کارٹر جیسے مدبرین کا ایقان ہے کہ

Marfat.com

حکمران کو اقدار و روایات کا نہ صرف ماننے والا بلکہ انہیں دوام دینے والا بھی ہونا چاہیے۔ تبھی تو انہوں نے اخلاقی اقدار کے زوال کو سیکولر، سرمایہ دارانہ جمہوریت کو فروغ دینے والے ملک کا سب سے اہم مسئلہ قرار دیا ہے۔

جمی کارٹر نے درست نتائج اخذ کیے ہیں کہ امریکی حکمرانوں کو اخلاقی اقدار سے دور کرنے والوں میں عیسائی بنیاد پرست اور دولت مند طبقہ سرِ فہرست ہیں۔ درحقیقت مذہبی اور سرمائے کی اجارہ داری قائم کرنے کے خواہش مند طبقوں نے ہی انسانی اقدار اور تہذیبی روایات کو، جو کہ ساری نوعِ انسان کا مشترکہ ورثہ ہیں، پامال کر دیا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ، سیکولر جمہوریت کے فروغ کے لیے افراد اور تنظیموں پر بے تحاشا سرمایہ کاری کرنے والے تجارتی و صنعتی اداروں کا مالک یا تو کوئی ایک شخص اور گھرانہ ہے یا چند افراد اور چند گھرانے۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہ جمہوری اقدار کے قائل ہیں تو اپنے کاروباری اداروں اور کارخانوں میں جمہوریت کیوں نہیں لاتے؟ فیصلہ سازی کے عمل اور انتظامی اختیارات میں عوام کی شرکت کے مطالبے کرنے اور کروانے والی بڑی کارپوریشنیں اپنی حدود میں انہی مطالبوں کو کیوں منظور نہیں کرتیں اور اپنی جسمانی و ذہنی محنت سے ان کارپوریشنوں کو ہر سال زیادہ منافع کما کر دینے والوں کو فیصلہ سازی کے عمل اور انتظامی اختیارات میں شریک کیوں نہیں کیا جاتا؟

میں زیرِ نظر اہم کتاب کے قارئین کو مذکورہ بالا سوالات پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہوں۔ آپ کی آراء اور تبصروں کا انتظار رہے گا۔

محمد احسن بٹ

Marfat.com

تعارف

سابق امریکی صدر جمی کارٹر امریکی ریاست جارجیا کے شہر پلینز (Plains) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے امریکہ کے انتالیسویں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی بیوی روزالین (Rosalyn) کے ساتھ مل کر ''دِی کارٹر سینٹر'' کی بنیاد رکھی، جو کہ ایک غیر منافع اندوز تنظیم (Nonprofit Organisation) ہے۔ ''دی کارٹر سینٹر'' تنازعوں سے بچنے اور انہیں حل کرنے، آزادی و جمہوریت کے فروغ اور صحت جیسے معاملات پر ساری دنیا میں کام کر رہی ہے۔

اب تک وہ متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں ''این آور بی فورڈے لائٹ''(An Hour Before Daylight) کو ''امریکی کلاسیک'' قرار دیا گیا ہے۔ 1981ء میں صدارت کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد صدر کارٹر کو ''دی کارٹر سینٹر'' کے انسان دوستانہ کام کے صلے میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔

صدر کارٹر نے اپنی روحانی زندگی اور عقائد کے حوالے سے اہم کتابیں لکھی ہیں۔ اپنی بہت زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ''لِونگ فیتھ''(Living Faith) میں انہوں نے اپنی نجی اور سیاسی زندگی کی صورت گری کرنے والی اقدار اور تجربات کا ذکر کیا ہے۔ اسی موضوع پر لکھی گئی اپنی ایک اور بہت زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ''سورسز آف سٹرینتھ''(Sources of Strength) میں انہوں نے بائبل کے باون اسباق پر اظہارِ خیال کیا۔

زیرِ نظر کتاب میں جمی کارٹر نے دورِ حاضر کے اہم مسائل و معاملات کے تناظر میں ''اخلاقی اقدار'' کے حوالے سے اپنے ذاتی خدشات کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے چرچ اور ریاست کو الگ الگ رکھنے کے حوالے سے زوردار دلائل دیئے ہیں اور اس امر پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ امریکہ میں سیاست اور تنگ نظر مذہبی بنیاد پرستی میں

Marfat.com

فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔

انہوں نے گذشتہ چند برسوں کے دوران رونما ہونے والے کچھ پریشان کن معاشرتی رجحانات کے حوالے سے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ تبدیلیاں مذہبی اور سیاسی ہر دو دنیاؤں میں وقوع پذیر ہوئی ہیں، کیونکہ ان دونوں کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ تبدیلیوں کا اثر دورِ حاضر کے چند انتہائی اہم اور متنازعہ معاملات پر بھی ہوا ہے ...... انہیں ہم اکثر ''اخلاقی اقدار'' کی اصطلاح کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

ان میں سے بیشتر معاملات پر تند و تیز بحث ہو رہی ہے۔ جن میں شامل ہیں پیش بندی کے طور پر کی جانے والی جنگ (Preemptive War) عورتوں کے حقوق، دہشت گردی، شہری آزادیاں، ہم جنس پرستی، اسقاطِ حمل، سزائے موت، سائنس اور مذہب، ماحولیاتی آلودگی، ایٹمی اسلحہ، امریکہ کا عالمی تصور و تاثر، بنیاد پرستی اور مذہب و سیاست کا یکجا ہونا۔

جمی کارٹر نے اِن موضوعات پر بھرپور اور واضح لیکن متوازن اور جرأت مندانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا اُن کے لاکھوں قارئین نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

Marfat.com

عرضِ مصنف

امریکی اپنے وطن کی عظمت پر مسرور وشادماں ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ ہمارے وطن کی بنیادی اخلاقی اقدار، عوامی مباحث اور سیاسی فلسفے میں وسیع اور عمیق تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

امریکی اپنے اور دوسروں کے لیے امن کے تحفظ، معاشی اور معاشرتی انصاف کے فروغ، انسانی حقوق کا پرچم بلند کرنے، ماحول کے تحفظ، انسانی مصائب کو ختم کرنے اور ان مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعاون کرنے کی خاطر امریکہ کی قوت اور اثر ورسوخ کو استعمال کرنے کے حوالے سے اپنے ملک پر بجا فخر کرتے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ متنوع اور اختراع وایجاد پسند آبادی کے حامل ملک کی حیثیت سے ہم اپنے شہریوں کو درست معلومات فراہم کرنے اور اختلافی آواز اٹھانے والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور متنازعہ موضوعات پر بحث مباحثے کو برداشت کرنے کی قدر (Value) اپنا چکے ہیں۔ ہمارے بیشتر سیاست دانوں نے ریاستی اور مقامی خودمختاری کو تقویت دینے، بجٹ کا خسارہ بڑھانے والے اخراجات پر قابو پانے، غیر ملکی ایڈونیچرازم (Adventurism) سے بچنے، امن قائم کرنے کے طویل مدتی وعدے کم کرنے، چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو برقرار رکھنے اور شہری آزادیوں (Civil Liberties) اور شخصی خلوت (Personal Privacy) کے تحفظ کی کوششیں کی ہیں۔

اب ان تمام تاریخی وعدوں (Historic Commitments) کو چیلنج کیا جارہا ہے۔

ہمیں جن متنازعہ مسائل کا سامنا ہے، ان میں سے بیشتر پر میرے صدر بننے

Marfat.com

سے بھی بہت پہلے بحث مباحثہ ہو چکا تھا۔ یہ تنازعات فطری ہیں، اوران میں سے اکثر ایسے ہیں کہ جن سے گریز کیا جا سکتا ہے۔ ان میں اسقاطِ حمل، سزائے موت، سائنس بمقابلہ مذہب، عورتوں کے حقوق، مذہب اور سیاست کی علیحدگی، ہم جنس پرستی، امریکہ کی خارجہ پالیسی اور ہمارا عالمی تصور و تأثر، شہری آزادیاں، دہشت گردی کا خطرہ، ایٹمی اسلحے کا پھیلاؤ، ملک میں بندوقوں اور پستولوں (Guns) کا حد سے زیادہ پھیلاؤ، امن اور جنگ میں انتخاب، ماحولیاتی آلودگی اور غریبوں کے لیے انصاف جیسے متنازعہ مسائل شامل ہیں۔

ان مسائل کے حوالے سے حال ہی میں ہونے والے مباحث کی وجہ سے ہمارے ملک میں ایسے اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور ایسی تقسیم رونما ہوئی ہے کہ جس کی پہلے کبھی مثال نہیں ملتی۔ اس کا اظہار انتخابات جیتنے کے لیے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹیوں کا تہمت و دشنام بھرے اشتہارات پر انحصار کرنے، کانگرس کے جانبدارانہ کردار اور ہماری پوری قوم کا ریاستوں کے اندر اور ریاستوں کے مابین ''سرخ'' اور ''نیلی'' کی اصطلاحوں کو استعمال کرنے کی عادت بنا لینے سے ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان شدید تنازعات کو کس نے جنم دیا، نیز امریکہ کی روایتی اقدار کو کس نے خطرے میں ڈالا؟ ایک عامل (Factor) تو 11 ستمبر 2001ء کے دہشت گردانہ حملے کے حوالے سے ہمارا قومی ردِ عمل ہے۔ اس حملے کے بعد ہمیں دہشت گردی کی شدت اور اس کی مستقل اور عالمگیر نوعیت کا ادراک ہوا۔ دوسری اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ سیاسی عمل میں بڑی بڑی رقومات خرچ کی جانے لگی ہیں نیز پہلے ادوارِ حکومت کے مقابلے میں موجودہ حکومت کے دور میں ایسا پہلی بار ہو رہا ہے کہ مخصوص مفادات رکھنے والوں کی خاطر حکومت من مرضی سے خفیہ اقدامات کر رہی ہے۔

سب سے اہم عامل یہ ہے کہ بنیاد پرست مذہب اور حکومت میں بہت تیزی سے اثر بڑھا رہے ہیں اور تاریخی مباحثے کے معمولی اور محض ظاہری اختلافات کو سیاہ اور سفید کے کٹڑ پن میں تبدیلی کر چکے ہیں نیز مخالفت کا حوصلہ کرنے والوں کی بے عزتی و بے توقیری کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مذہبی اور سیاسی قدامت پرست لوگ چرچ

Marfat.com

اور ریاست کے مابین موجود پہلے کبھی نہ پاٹی جا سکنے والی خلیج پر پُل باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے بااثر ''نئے قدامت پسندوں'' (Neoconservatives) کے ایک گروہ کو طاقت اور تقویت ملی ہے، اور وہ داخلہ اور خارجہ پالیسی پر اپنے پرانے اضطراب زدہ فلسفے کو حاوی کرنے کے اہل ہو گئے ہیں۔

ان مختلف رجحانات سے ہماری قوم کی بہت سی تاریخی روایات اور اخلاقی اقدار ....حکومت اور عبادت گاہوں، ہر دو مقامات پر.......... خطرے میں پڑ گئی ہیں۔

انتہائی تنگ نظری پر مبنی مذہبی عقائد کو سیاسی پارٹیوں کا بے لچک ایجنڈا بنا لیا گیا ہے۔ حکومت کے اندر اور باہر موجود لابی کاروں (Lobbyists) نے آزاد سوچ اور عمل کے قابلِ تحسین امریکی ایقان (Belief) کو انتہائی دولت مند شہریوں کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے اور ساری کی ساری دولت صرف اپنے وارثوں ہی کو منتقل کرنے کے حق میں بدل دیا ہے۔ سکول ٹیچروں اور آگ بجھانے والے کارکنوں کی تنخواہوں میں سے تو ٹیکس کاٹا جاتا ہے لیکن حصص کی خرید و فروخت سے بے پناہ منافع کمانے اور ڈِوِی ڈینڈز (Dividends) سے آمدنی حاصل کرنے والوں کو مراعاتی ٹیکس سٹیٹس (Privileged Tax Status) دے دیا گیا ہے۔ میرے ایک عیسائی دوست کے بقول واشنگٹن کا معاشی فلسفہ یہ ہے کہ ایک چڑھتی ہوئی لہر ساری کشتیوں کو اٹھا دیتی ہے۔

انتہائی سخت گیر مؤقف کے حامل لوگوں نے اپنے اقلیتی خیالات کو ایک زیادہ اعتدال پسند اکثریت پر تھوپ کر اسقاطِ حمل، ہم جنس پرستی اور دوسرے حساس سماجی مسائل و معاملات کے حوالے سے ختم نہ ہو سکنے والے اختلافات کو مزید بڑھا دیا ہے۔

ہمارا ملک بین الاقوامی تنظیموں کی حدوں سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکا ہے نیز بہت سے پرانے عالمی معاہدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، جن میں عدالتی فیصلے، ایٹمی اسلحہ کے حوالے سے کیے گئے معاہدے، حیاتیاتی (Biological) ہتھیاروں پر کنٹرول کے معاہدے، ماحول کے تحفظ کے معاہدے، انصاف کا بین الاقوامی نظام، اور قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کے معاہدے شامل ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے فوجی جوان میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار ہیں اور امریکہ کو مزید دہشت

Marfat.com

گردانہ حملوں کا شکار ہونے کا خطرہ درپیش ہے لیکن ہم نے اپنے اتحادیوں کو اور ایسے ملکوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن کی مدد ہمیں عالمی دہشت گردی کے خلاف طویل جنگ کے دوران درکار ہے۔ ان سب سیاسی اقدامات کی بیک زبان تائید ان لوگوں نے کی ہے، جن کا ایقان ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی محیر العقول قوت اور اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے غیر ملکیوں کی پابندیاں قبول نہیں کرنی چاہئیں۔ امریکہ میں کچھ لیڈر ایسے بھی ہیں جو مصارف کی فکر کیے بغیر کھلم کھلا اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ پوری دنیا پر امریکہ کا استعماری تسلط قائم کیا جائے۔

انہی تصورات کے باعث اب یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ دوسرے ملکوں پر فوجی حملہ کرنے سے پہلے مذکورہ بالا پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ جبکہ ان ملکوں کے حوالے سے نامعتبر جاسوسی ذرائع دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی سیاسی یا فوجی پالیسیاں آخرِ کار امریکہ کے لیے خطرناک ثابت ہوں گی۔ ان پر ''بدی کے محور'' کا لیبل چسپاں کرنے کے بعد انہیں گلی کے آوارہ کتوں اور شودروں جیسا حقیر و ذلیل تصور کیا جاتا ہے، کہ جن کے ساتھ مزید مذاکرات نہیں ہو سکتے نیز ان ملکوں کے عوام کو معمولی سی بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔

خوش قسمتی سے یہ قومی پالیسیاں اور عدم آہنگی ابھی تک مستقل نہیں ہو پائی ہیں کیونکہ عوام، قانون سازوں، وفاقی ججوں، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی اکثریت نے بیشتر متنازعہ مذہبی اور سیاسی سوالوں کے متفقہ جوابوں کی تلاش جاری رکھی ہوئی ہے۔ یہ امریکہ کے بہترین مفاد میں ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے اور زیادہ سے زیادہ مشترک مؤقف ڈھونڈے جائیں۔

مذہبی اور عوامی معاملات میں عمر کا ایک معتد بہ حصہ صَرف کرنے کے بعد مَیں اس اَمر کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ اِن حالیہ تبدیلیوں کو بڑھاوا دینے والے لوگ کتنے مخلص ہیں۔ مَیں ایک سب میرین افسر کی حیثیت سے حب الوطنی کی شدت، مسابقت کا سامنا کرنے والے بزنس مین کی کامیاب ہونے اور آگے بڑھنے کی بے انتہا خواہشات اور سیاسی مباحثے کی شدت کا تجربہ کر چکا ہوں۔ مَیں غیر ملکیوں پر حملے کے

Marfat.com

اقدام کی تکلیف دہ ترغیب کا سامنا کر چکا ہوں نیز یک طرفہ فیصلہ کن اقدام کرنے کی بجائے اتحادیوں یا سابق دشمنوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے اضطراب کو بھی محسوس کر چکا ہوں۔

مَیں ریاستی سینیٹر، گورنر اور صدر کی حیثیت سے سیاسی فیصلے کرتے وقت بہت زیادہ دباؤ برداشت کرنے کے مرحلے سے گزر چکا ہوں۔ اگرچہ میں چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو ایک آئینی اور انجیلی (Biblical) تقاضا تصور کرتا ہوں، تاہم مجھے یہ اعتراف ضرور کرنا چاہیے کہ میں نے جن سیاسی اصولوں کو اپنایا ہوا ہے میرے مذہبی عقائد ان میں الگ نہ ہونے کی حد تک سرایت کیے ہوئے ہیں۔

ایک عام شہری کی حیثیت سے میں نے اس کتاب میں ارادتاً مذہب اور سیاست کو باہم ملایا ہے۔ پہلے میں نے اخلاقی اقدار کا مذہبی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے اور پھر ان اقدار پر حالیہ سیاسی فیصلوں کے منفی اثرات کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ایک ''دوبارہ پیدا ہونے والے'' (Born Again) ایوانجیلیکل اور عیسائی ایک سابق سیاسی لیڈر کی حیثیت سے میں نے مقدور بھر بے تکلفی کے ساتھ اپنی آراء کو پیش کیا ہے۔ مذہبی اقلیم میں مَیں نے مقدس کتابوں پر انحصار کیا ہے، جن کی تعبیر یسوع مسیحؑ کے کلام اور عمل سے کی جاتی ہے۔ سیاسی معاملات پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے میں نے اپنے تجربات اور مشاہدات پر انحصار کیا ہے۔

مجھے اس حقیقت کا علم ہے کہ بعض قارئین، حتیٰ کہ ایسے قارئین بھی کہ جن کا مذہبی اور سیاسی پس منظر مجھ جیسا ہی ہے، میری بعض آراء کو اپنی آراء سے مختلف پائیں گے۔ یہ اَمر کافی حد تک یقینی ہے کہ ان میں سے بہت سوں کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ امریکہ میں ہو کیا رہا ہے۔ اسی لیے ان مسائل کو زیادہ سے زیادہ بحث مباحثے کا موضوع بنانا فائدہ بخش ہو سکتا ہے۔

جمی کارٹر

Marfat.com

81661

Marfat.com

پہلا باب

امریکیوں کے مشترک اعتقادات اور سنگین اختلافات

ہمارے ملک میں زیرِ بحث انتہائی متنازعہ مسائل پر اگلے ابواب میں اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ بہتر تفہیم کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ امریکی شہریوں کی موجودہ ذاتی آراء کیا ہیں، ان میں کون کون سے اختلافات اور اتفاقات ہیں، ان میں کیسے تبدیلی آئی ہے یا وہ ویسے ہی رہے ہیں، اور کیا وہ ہمارے ملک میں ہونے والی گہری سیاسی تبدیلیوں سے متفق ہیں۔

حالیہ برسوں میں امریکیوں کے درمیان سنگین نوعیت کے اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ جب میں وائٹ ہاؤس میں تھا، تب ایسا نہیں تھا۔ اس زمانے میں کانگرس میں میری پیش کردہ تجاویز کی قبولیت کے حوالے سے میری ''بیٹنگ اوسط'' اچھی تھی۔ اس زمانے میں اختلافات کی بنیاد مسائل ہوتے تھے، یہ تصور نہیں کہ فلاں فلاں اراکین ڈیموکریٹ ہیں یا ری پبلکن۔ ایک جنوبی اعتدال پسند اور سابق نیوی افسر کی حیثیت سے میں نے ایک قدامت پسندانہ مالی پالیسی وضع کی اور دفاع کی مضبوطی کو فوقیت دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ انسانی حقوق سے میری وابستگی کا سبب یہ تھا کہ میں ملک کے جس حصے میں رہتا ہوں، وہاں نسلی امتیاز کے تباہ کن اثرات کا ذاتی علم رکھتا ہوں۔ واشنگٹن پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد میں اس وقت بڑا حیران اور نا اُمید ہوا تھا جب کانگرس کے کسی ڈیموکریٹک رکن نے میری قانون سازی کی تجاویز کی حمایت نہیں کی .... ان تجاویز کا مقصد وفاقی بیوروکریسی کی تنظیمِ نو تھا .... اور مجھے حمایت کے لیے ری پبلکنوں سے رجوع کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد مجھے مختلف معاملات پر دونوں پارٹیوں

Marfat.com

کے اراکینِ کانگرس کی حمایت حاصل ہوتی رہی۔ جبکہ ڈیموکریٹک پارٹی کے لبرل وِنگ کی طرف سے مجھے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ (اس مخالفت کا ایک سبب یہ تھا کہ سینیٹر ٹیڈ کینیڈی میری جگہ صدر بننے کے خواہش مند تھے۔)

واشنگٹن میں بنیاد پرستی

آج کل واشنگٹن کا منظر مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہے اور تقریباً ہر معاملے پر سخت جانبدارانہ بنیادوں پر فیصلے کیے جا رہے ہیں۔ کلیدی نوعیت کے قانون سازی کے فیصلوں پر عوامی مباحثہ کروانا اب قصہ ماضی بن چکا ہے۔ بنیادی معاہدے لابی کاروں اور قانون ساز لیڈروں کے مابین ہوتے ہیں، جن میں اکثر پارٹی کے بند اجلاسوں میں ہوتے ہیں، کہ جہاں سخت پارٹی نظم حاوی ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ذاتی احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ پہلے سینیٹ میں اس کا چلن بالخصوص ہوتا تھا۔ کانگرس میں ہم آہنگی اور تعاون کی فضا ختم ہو جانے کا، کم از کم جزوی حد تک، سبب یہ ہے کہ بنیاد پرست رجحانات عروج پر ہیں اور مذہب و سیاست پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے یہ سخت گیری اور تصادم ابھی تک عوام میں نہیں پھیلے۔ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے میں نے امریکی رائے عامہ کو جاننے کی کوشش کی تا کہ میں لوگوں کے درمیان موجود اختلافات اور اتفاقات کے اسباب کو سمجھ سکوں۔

ڈیموکریٹوں اور ری پبلکنوں کی اکثریت اس بات سے متفق ہے کہ آج ہمارا ملک سیاسی حوالے سے جتنا تقسیم ہو چکا ہے، اتنا کبھی نہیں رہا ہے۔ اس حقیقت کی عکاسی 2000ء کے مشکوک صدارتی انتخاب اور اس کے بعد کے برسوں میں امریکی ریاستوں میں ''سرخ'' اور ''نیلی'' کی تقریباً ختم نہ کی جا سکنے والی تقسیم سے ہوتی ہے۔ ہمارے دو صدور کی حمایت اور عدم حمایت میں بہت تھوڑا فرق تھا، جبکہ صدر بش کو ڈیموکریٹوں میں اتنی مقبولیت بھی حاصل نہیں تھی جتنی کہ صدر کلنٹن کو مواخذے کے دوران ری پبلکنوں میں حاصل تھی۔ عراقی جنگ، جو کہ ہنوز جاری ہے، بالخصوص تشویش انگیز ہے۔ اس حوالے سے قطعاً متضاد آراء پائی جاتی ہیں کہ آیا تنازعہ بہتر چل رہا ہے یا قومی سلامتی

Marfat.com

بہتر ہوئی ہے۔

بین الاقوامی جھگڑے اور فوجی ایکشن

ان واضح اختلافات کو محض معمولی سے اختلافات قرار دے کر ٹالا جا سکتا ہے، تاہم ہماری قوم کی حالیہ اور مستقبل کی بین الاقوامی پالیسیوں پر ان کا اثر اہم ہے۔ جہاں تک ری پبلکنوں کا تعلق ہے تو وہ فوجی ایکشن کو مذاکرات پر واضح ترجیح دیتے ہیں جبکہ ڈیموکریٹوں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ دہشت گردی سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے دو تہائی ری پبلکنوں کا ایقان ہے کہ بے تحاشا طاقت کا استعمال بہترین ہے، جبکہ ڈیموکریٹوں کی اس سے بھی زیادہ تعداد کا خیال ہے کہ قومی سلامتی خطرے میں ہو تو ہماری مسلح افواج کو ضرور استعمال کیا جانا چاہیے، تاہم ضرورت سے زیادہ فوجی ایکشن سے ہمارے ملک کے خلاف نفرت بڑھتی ہے اور مزید دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی جھگڑوں کو ڈپلومیسی یا فوجی ایکشن کے ذریعے حل کرنے کے مسئلے پر یہ گہرا اور تیزی سے بڑھتا ہوا اختلاف اب پارٹی تعلق کا سب سے درست عکاس بن گیا ہے اور گے میرج (Gay Marriage)، ہم جنس پرستی، اور اسقاطِ حمل جیسے مسائل سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

یہ اَمر حوصلہ بخش ہے کہ امریکیوں کی کثیر تعداد بہت سے اہم مسائل پر بھرپور اتفاق رکھتی ہے۔ ان میں فرد کی زندگی میں مذہب کی قدر، انسانی امکان کا ادراک پانے کے لیے شخصی پہل (Personal Initiative) کی قوت، ماحول کے تحفظ کی ضرورت .... خواہ یہ عمل مہنگا ہی کیوں نہ ہو، بڑے کاروبار کی مستقل کامیابی کے حوالے سے تشکیک، اور فحاشی کا کاروبار کرنے والوں کے خلاف فحاشی کے وفاقی قانون کے تحت سے اطلاق کی خواہش شامل ہیں۔

ماحول کا تحفظ اور غریب

اس خیال کے حامی لوگ بہت کم ہیں کہ ماحول کے تحفظ کے سخت قوانین کے نفاذ سے معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ حکومت پر اعتماد کے حوالے سے ری پبلکنوں کی تعداد

Marfat.com

میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اب اس حوالے سے پارٹیوں میں اختلاف بہت کم ہو گیا ہے۔امریکی لوگ غریبوں اور ضرورت مندوں کے لیے حکومت کے امدادی پروگراموں کی زیادہ تائید کرنے لگے ہیں، تاہم ایک فرق یا اختلاف یہ رہ گیا ہے کہ ڈیموکریٹوں کے مقابلے میں ری پبلکنوں کی زیادہ تعداد یہ ایقان رکھتی ہے کہ غریبوں کی زندگیاں آسان ہیں۔ یہ اَمر حوصلہ بخش ہے کہ تمام امریکیوں میں غریبوں کے خلاف تعصب میں بہت کمی آ چکی ہے۔

سماجی مسائل کے حوالے سے اختلافات

امریکہ میں سماجی مسائل کے حوالے سے اختلافات بہت زیادہ ہیں لیکن بہت سی آراء میں تبدیلی آ رہی ہے اور سیاسی عمل پر ان کا واضح اثر بہت کم ہے۔ متنازعہ معاملات پر احساس کی شدت اکثر عددی تفریقات کی نسبت بہت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ یہ اَمر اس وقت زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب مسئلہ اسقاطِ حمل یا گن کنٹرول کا ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں کہ جن کے حوالے سے امریکیوں کی مستقل اکثریت کی رائے سیاست پر بہت ہی کم اثر انداز ہوئی ہے۔

اسقاطِ حمل

امریکیوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ اسقاطِ حمل کو مکمل طور پر یا بیشتر صورتوں میں قانونی قرار دے دیا جانا چاہیے۔ چھ میں سے صرف ایک امریکی کا ایقان ہے کہ ہر اسقاطِ حمل کو غیر قانونی قرار دیا جانا چاہیے۔ اس مختصر سی اقلیت کے جوش و ولولے اور فعالیت نے ان کے اثر و رسوخ کو، خصوصاً امریکی کانگرس میں، بہت بڑھا دیا ہے۔

گن کنٹرول

جہاں تک گن کنٹرول کا معاملہ ہے تو امریکیوں کی بہت بڑی اکثریت کا ایقان ہے کہ اسلحہ رکھنا ہر شخص کا حق ہے، تاہم پانچ میں سے چار امریکی اس بات کو ترجیح

Marfat.com

دیتے ہیں کہ ہینڈگنوں پر نرم پابندی ہونی چاہیے، اسلحہ رکھنے والے کے پس منظر کا جائزہ لیا جانا چاہیے، رجسٹریشن ضروری ہونی چاہیے اور اسلحہ خریدنے سے پہلے خریدار کو کچھ عرصہ انتظار کروایا جانا چاہیے۔

آتشیں اسلحے کی صنعت کے حوالے سے حکومتی پالیسی میں تبدیلی پریشان کن ہے۔ ریگن، بش اور کلنٹن تینوں صدور کی مسلسل و متواتر حمایت سے کانگرس نے 1994ء میں ایک قانون منظور کیا، جس کے تحت اُنیس نیم خودکار ہتھیاروں کی تیاری، منتقلی اور ملکیت پر دس سال کے لیے پابندی لگا دی گئی۔ ان ہتھیاروں میں اے کے۔47، اے آر۔15 اور یوزی جیسی گنیں شامل تھیں۔ ان میں سے کوئی رائفل شکار کے لیے استعمال نہیں ہوتی .... انہیں صرف انسانوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ 2004ء میں کانگرس اور صدر نے مہلک اسلحے پر پابندی کے وفاقی قانون کی تجدید اور اسے زیادہ مضبوط بنانے کے لیے ملک بھر سے گیارہ سو پولیس چیفس اور پولیس شیرفس کو بلایا لیکن وائٹ ہاؤس کے ایک اشارۂ ابرو سے گن لابی حاوی ہوگئی اور پابندی کا قانون غیر مؤثر ہوگیا۔

یہ ایسا تنازعہ نہیں ہے کہ جس میں صرف گھروں میں ہتھیار رکھنے والے، شکاری اور گھروں سے باہر رہنے والے اسلحہ مالکان شامل ہوں۔ خود میرے پاس اُس وقت ایک بندوق تھی جب مَیں اُسے اٹھانے کے قابل بھی نہیں تھا، اور میں نے اسے استعمال بھی کیا تھا۔ اب میرے پاس ایک ہینڈگن، چار شاٹ گنیں اور دو رائفلیں ہیں۔ میں انہیں بہت احتیاط سے استعمال کرتا ہوں۔ میں انہیں اپنے کھیتوں اور جنگلوں میں فصل کی کٹائی کے موسم میں شکار کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار اپنے خاندان کے افراد اور دوستوں کے ہمراہ دوسرے مقامات پر جاکر شکار کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ ہم ان حقوق کو استعمال کرکے خوش ہوتے ہیں۔ میرے کچھ دوست تو نایاب ہتھیاروں کو جمع کرنے کے شوقین ہیں۔

بیرونِ خانہ کھیلوں (Outdoor Sports) سے لطف اندوز ہونے والے ہم لوگوں میں سے اکثر کو نیشنل رائفل ایسوسی ایشن (این آر اے) کی چند انتہا پسندانہ

Marfat.com

پالیسیوں سے مایوسی ہوئی ہے نیز ان سرکاری حکام کی بزدلی سے، جو این آر اے کے غیر معقول مطالبات مان چکے ہیں۔ این آر اے پر آتشیں اسلحے کی صنعت کا زبردست اثر ہے۔ اُس نے اِسی اثر کے باعث ناسمجھ لوگوں کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ ہم سے ہتھیار لے لیے جائیں گے، اور یہ کہ گھروں میں ہتھیار رکھنے والوں کو اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ حالانکہ امریکی آئین کے تحت ہمارے ''اسلحہ رکھنے کے حق'' کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو این آر اے کی کوششیں درست اور جائز قرار پاتیں۔

مہلک ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا ایک رُخ اور بھی ہے۔ گن لابی مہلک ہتھیاروں کو پابندی سے استثنا دلا کر ایسے مجرموں اور گروہ بازوں کی مدد کر رہی ہے جو اپنے فرائض ادا کرنے والے پولس افسروں کو اِن ہتھیاروں کے ذریعے جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں کیونکہ پولیس افسروں کا حفاظتی لباس ایسی خطرناک بندوقوں کی گولیاں نہیں روک سکتا۔ اس کے علاوہ کسی مشتبہ یا یقینی دہشت گرد کو کوئی آتشیں ہتھیار خریدنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ این آر اے نے بڑی بحث وجدل کے بعد یہ پابندی قبول کی ہے کہ کسی شخص سے ماضی میں جرم سرزد ہونے کے شواہد ہوں تو وہ بندوق خرید یا رکھ نہیں سکے گا، ذہنی اختلال کے شکار لوگ اسلحہ نہیں خرید سکیں گے، نہ ہی اپنے پاس ہتھیار رکھ سکیں گے اور غیر قانونی تارکینِ وطن نہ اسلحہ خرید سکیں گے، نہ اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ جب حال ہی میں مشتبہ دہشت گردوں کی فہرست میں شامل 44 افراد میں سے 35 نے پانچ ماہ کے عرصے کے دوران بندوقیں خریدیں تو ایف بی آئی کے ڈائریکٹر نے اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے موجودہ قانون کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کیا اور چند امریکی سینیٹروں سے کہا کہ وہ اس قانون میں ترامیم کے بارے میں غور کریں۔ اس حوالے سے این آر اے کے اعلیٰ عہدے داروں کا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے دہشت گردوں پر نہیں بلکہ واچ لسٹوں (Watch Lists) پر تنقید کی اور ایسی قانون سازی کی حمایت کا اعلان کیا جو کسی خریدار کے اے کے۔ 47 رائفل کو دہشت گردانہ حملے میں استعمال کرنے پر رائفل بنانے اور بیچنے والے کو الزام سے محفوظ رکھے۔ این آر اے کا

Marfat.com

یہ بھی اصرار ہے کہ اسلحے کے خریداروں کے پس منظر کے حوالے سے حاصل کی جانے والی معلومات کو 24 گھنٹے بعد ضائع کر دیا جائے۔ حالانکہ ایسی معلومات کو طویل عرصے تک محفوظ رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں پتا چلنے کا امکان ہوتا ہے جو ہمارے ملک کے خلاف سازشیں کر رہے ہوں۔

سب سے زیادہ قتل امریکہ میں ہوتے ہیں

سوال یہ ہے کہ انسانوں کو ہلاک کرنے کے لیے بنائی جانے والی بندوقوں کی غیر ضروری ملکیت اور استعمال سے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ سینٹرز فار ڈیزیز کنٹرول اینڈ پری وینشن (Centers For Disease Control and Prevention) کے مطابق دوسرے صنعتی ملکوں کے بچوں کے مقابلے میں امریکی بچوں کے کسی بندوق سے ہلاک ہو جانے کے سولہ گنا زیادہ امکانات ہیں، کسی بندوق سے خودکشی کے امکانات گیارہ گنا اور آتشیں اسلحے سے حادثاتی طور پر ہلاک ہو جانے کے نو گنا زیادہ امکانات ہیں۔

جانز ہاپکنز سینٹر فار گن پالیسی اینڈ ریسرچ (Johns Hopkins Center For Gun Policy and Research) کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں آتشیں اسلحے سے قتل کی شرح 35 زیادہ آمدنی والے ملکوں میں آتشیں اسلحے سے قتل کی مجموعی شرح سے 19 گنا زیادہ ہے۔ اس سال آسٹریلیا میں ہینڈ گنوں سے 334 لوگوں کو قتل کیا گیا، برطانیہ میں 197، سویڈن میں 183، جاپان میں 83، آئرلینڈ میں 54، کینیڈا میں 1034 جبکہ امریکہ میں 30419 افراد کو ہینڈ گنوں سے قتل کیا گیا۔

نیشنل رائفل ایسوسی ایشن، آتشیں اسلحے کی صنعت اور شکایت کرنے والے سیاست دانوں کو تحفظ اور احتساب کے حوالے سے اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

ہم جنس پرستی

جب امریکیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ ذاتی طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کا اپنی ہی صنف کے افراد کے ساتھ جنسی عمل کرنا

Marfat.com

قابلِ قبول ہے؟ تو ان کی اکثریت اثبات میں جواب دیتی ہے۔ اب سے بیس برس پہلے لوگوں کی رائے اس سے بہت مختلف ہوا کرتی تھی اور ایسے ہی سوالوں کے جواب مذکورہ بالا جواب کے برعکس دیئے جاتے تھے۔ اس امر کے بھی چند اشارے ملے ہیں کہ عوامی رائے میں اس تبدیلی کا اثر ریاستی اور وفاقی ججوں پر بھی پڑا ہے۔

سزائے موت

سزائے موت کے حوالے سے بھی امریکیوں کے خیالات میں تبدیلی آ رہی ہے، ساتھ ہی ''پیرول کے بغیر زندگی'' (Life without Parole) کی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ صرف ایک تہائی لوگوں کو یقین ہے کہ سزائے موت جرائم میں کمی لاتی ہے۔ ایک ملک گیر سروے میں صرف ایک فی صد پولیس چیفس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ سزائے موت سے جرائم کے ارتکاب میں کمی آتی ہے۔ رائے عامہ میں اس تبدیلی کا اثر بھی ریاستی قانون ساز اداروں اور وفاقی عدالتوں پر پڑا ہے۔

ان اعداد وشمار سے امریکی شہریوں کی یقینی آراء کی عکاسی ہوتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں گذشتہ پانچ برسوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بایں ہمہ ہماری حکومت کی داخلہ اور خارجہ پالیسوں میں انقلابی تبدیلیاں (Revdutionary Changes) آئی ہیں، جن کا ''اخلاقی اقدار'' کی تعریف (Definition) اور تحفظ پر بہت اثر پڑا ہے۔

ایک ایسے امریکی کی حیثیت سے، کہ جو اپنے ملک کی سیاسی زندگی میں گہرائی تک شامل رہا ہو، میں ان اعداد وشمار کو بہت دلچسپ پاتا ہوں۔ تاہم دوسرے تقریباً تمام شہریوں کی طرح میری آراء اور دوسروں کے مجموعی خیالات وتصورات کے حوالے سے میرے شخصی ردِّ عمل کی صورت گری میں میری نجی زندگی کا کردار سب سے اہم رہا ہے۔

Marfat.com

دوسرا باب

میرا روایتی عیسائی عقیدہ

حالیہ برسوں میں مذہب کو حیران کن حد تک سیاسی اقلیم (Political Realm) میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے عقائد کے بارے میں پڑھ کر قارئین میرے چند فیصلوں کی وجوہات کو سمجھ جائیں اور انہیں میرے بارے میں اندازہ لگانے میں آسانی ہو۔

میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا، جنوبی بپٹسٹ (Southern Beptist) کی حیثیت سے پرورش پائی، اور ساری زندگی بائبل کے ہفتہ وار اسباق میں حصہ لیتا رہا.......... پہلے طالبِ علم کی حیثیت سے اور پھر بالغ ہونے کے بعد سے ٹیچر کی حیثیت سے.......... مجھے میرے بنیادی یا روایتی اعتقادات سے میرے والد نے جامعیت کے ساتھ روشناس کرایا تھا۔ وہ پلینز بپٹسٹ چرچ کے ڈیکن اور چرچ کے سنڈے سکول میں میرے استاد تھے۔ اگرچہ ہم ہفتہ وار اسباق کے متن کے مفاہیم کے حوالے سے گفتگو تو کرتے تھے لیکن ہم نے اپنے عقیدے کو تشکیل دینے والی معیاری الٰہیات پر سوال اٹھانے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔

میرا عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح نجات دہندہ اور خداوند کے بیٹے ہیں۔ پروٹیسٹنٹ، رومن کیتھولک، مشرقی آرتھوڈوکس، کوپٹس (Copts)، سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ اور بہت سے دوسرے مذہبی لوگ بھی بغیر کوئی سنجیدہ سوال اٹھائے ان عقائد کو مانتے ہیں۔ ہم نے اپنے بپٹسٹ فرقے کی کچھ خاص باتوں کو بھی دل و ذہن میں جذب کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک بپتسمہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو اتنے پختہ فکر و بالغ نظر ہوں کہ یسوع مسیح پر شخصی ایمان لا سکتے ہوں۔ پانی میں غوطہ دینا ہمارے نجات دہندہ کی موت، تدفین اور حیاتِ نو کی علامت ہے۔ ہم کتابِ مقدس کو مکمل طور پر

Marfat.com

خداوند کا ارادہ مانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ یسوع مسیح کے الفاظ و اعمال ہی کے مطابق انجیلِ مقدس کی تعبیر و تشریح کی جانی چاہیے۔ چنانچہ کتابِ مقدس کی اکثر و بیشتر مددگار ثابت ہونے والی انسانی تشریحات کو منزہ عن الخطا یا مصدقہ مذہبی ضوابط کا مجموعہ یا ایمانی احتساب کے ذرائع نہیں مانا جاتا۔

ہم ہر مقامی چرچ کی خودمختاری پر یقین رکھتے ہیں، جہاں فیصلے اس کے بپتسمہ یافتہ اراکین کے ووٹ کے ذریعے ہوتے ہوں (کامل اتفاقِ رائے کی امید کی جاتی ہے)۔ چرچ کے اندر کا معاملہ یہ ہے کہ بپٹسٹ افراد پر پیسٹرز (Pastors) کے غلبے کی مخالفت کرتے ہیں، یا کسی بھی دوسرے طاقتور شخص کی، اور ہم بائبل میں درج ان مثالوں پر اصرار کرتے ہیں جن کے مطابق یسوع مسیح نے اپنے حواریوں کو بھی دوسرے لوگوں پر کوئی اتھارٹی نہیں دی تھی۔ آپؑ نے انہیں مشاہدین کی حیثیت سے صرف دوسروں کی خدمت کرنے کی ہدایت دی تھی، ان کی مصیبتوں کو دور کر کے اور سچ کی مدد کر کے، عفو و درگذر کے ذریعے، اور محبت کے ذریعے۔ درحقیقت ہر اس شخص کو جو یسوعؑ پر ایمان رکھتا ہو، پادری (Priest) مانا جاتا ہے، جسے کسی وسیلے کے بغیر خداوند سے تعلق قائم کرنے کی آزادی حاصل ہے۔

ایوانجیلیکل کی حیثیت سے ہمارا عالمی مشن یہ ہے کہ بغیر کسی تعصب یا امتیاز کے اپنا عیسائی عقیدہ دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ ہم یسوع مسیح کی اس ہدایت پر اپنی ذاتی شہادت (Witnessing) کے ذریعے یا دوسروں کے لیے باقاعدگی کے ساتھ مالی قربانی دے کر عمل کرتے ہیں۔ میری زندگی کے بیشتر حصے میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ہمارے بیپٹسٹ چرچ جنوبی بیپٹسٹ کنونشن کے رکن ہوں گے، جس کا بنیادی مقصد امریکہ اور دنیا بھر میں ہمارے مشنری کام میں تعاون دینا تھا۔ تاہم اس سے یہ مراد نہیں ہوتا تھا کہ کنونشن کے افسر یا کوئی بیرونی مذہبی پیشوا عقائد یا قوانین کا ایسا مجموعہ مرتب کر سکتا ہے کہ جسے ہمیں ماننا ہوگا۔ ہمارے عقیدے میں صرف انجیل مقدس ہی اس حیثیت کی حامل ہے۔

ہمارا ایک اور پختہ عقیدہ چرچ اور ریاست کی مکمل علیٰحدگی ہے۔ یہ بہت اہم

Marfat.com

معاملہ تھا، اور ہم نے ایسے عیسائی شہیدوں (Martyrs) کے بارے میں پڑھا تھا جنہوں نے اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن کسی غیر مذہبی رہنما (سیکولر لیڈر) کو مذہبی آزادی میں دخل اندازی نہیں کرنے دی۔ اگرچہ کچھ عیسائی افراد کو (بشمول میرے والد کے) عوامی معاملات میں حصہ لینے کی آزادی دی گئی تھی، تاہم جانبدارانہ سیاسی دنیا میں چرچ کے داخلے کا تصور ہمیں بہت بُرا لگتا تھا۔ ہم مذہبی آزادی، عیسائی عقیدہ نہ رکھنے والوں کے لیے ہمدردی اور خداوند کے سامنے برابری کے حامل تمام انسانوں کے احترام پر ایمان رکھتے تھے۔

سال میں کم از کم ایک اتوار ماحول کے تحفظ یا زمین کی خدمت کے لیے وقف ہوتا تھا۔ میرے والد اور چرچ کے دوسرے اراکین پیسٹر کے اُن وعظوں کو بڑی توجہ سے سنتے تھے جو ''زمین خداوند کی ہے، اور جو کچھ اس میں ہے سب خداوند کا ہے'' جیسے متون سے اخذ کیے گئے ہوتے تھے۔ جب انسان کو زمین، پانی، مچھلیوں، جانوروں اور ساری فطرت پر غلبہ عطا کیا گیا تو زور اس امر پر دیا گیا کہ وہ ان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرے گا، نہ کہ انہیں ضائع اور تباہ کرے۔

مَیں نے اوپر والے پیراگراف میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے، تاہم یہ آج بھی میرے پختہ عقائد ہیں، بحیثیت ایک ایوانجیلیکل عیسائی اور بیپٹسٹ کے۔ اصطلاح ''ایوانجیلیکل'' کو اکثر یا تو غلط استعمال کیا جاتا ہے یا مسخ کر دیا جاتا ہے، تاہم میں اس کے دو بنیادی معنی کو کافی تصور کرتا ہوں: (الف) ''ان عیسائی چرچوں (Churches) سے تعلق رکھنے والا، جو چرچ کی مقتدرہ کے بَرخلاف بائبل، بالخصوص عہد نامۂ جدید کی تعلیمات اور مقتدرہ پر زور دیتے ہیں، اور جو اس عقیدے کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں کہ یسوع مسیح کے کفارے پر ایمان رکھنے سے شخصی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ یا (ب) 1970ء کی دہائی کے اواخر کے عیسائی جو بنیاد پرست کے خطاب سے تو گریز کرتے ہیں تاہم انجیل کی قدامت پسندانہ تعبیر کو مانتے ہیں۔'' (رینڈم ہاؤس ڈکشنری آف دی انگلش لینگویج)۔

چونکہ میری والدہ اور میری بیوی میتھوڈسٹ (Methodist) تھیں، اس لیے

Marfat.com

میں ہمیشہ یہ مانتا تھا کہ عبادت اور اجتماعی رسومات کے فرق کے باوجود سب راسخ العقیدہ عیسائی ہو سکتے ہیں اور ہمارے عقیدے (Our Faith) پر ہم آہنگی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ ممتاز بپٹسٹوں کی جانب سے ایسے بیانات پریشان کن ہیں کہ ''تم کہتے ہو کہ تم اپسکو پیلینز اور پریسبائٹیریز اور میتھڈسٹس اور فلاں فلاں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اپنا فرض سمجھتے ہو۔ بکواس میں تو اینٹی کرائسٹ کی روح کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کروں گا۔'' (پیٹ رابرٹس، دی 700 کلب)

میں نے امریکی نیول اکیڈمی میں مڈشپ مین (Midshipman) کی حیثیت سے افسروں کے بچوں اور ایناپولس میں خدمات انجام دینے کے لیے بھرتی کیے گئے جوانوں کو بائبل کے سبق دیئے۔ اس زمانے میں مَیں نے چند ممتاز الٰہیات دانوں کے تصورات کو گہرائی سے جاننا سمجھنا شروع کیا۔ بعد میں گورنر کے انتخاب کے دوران میں نے کہا کہ میں نے رائنہولڈ نیبوہر (Reinhold Niebhhr) کی کتابوں کو بالخصوص فائدہ مند پایا۔ مجھے بعد میں اُس وقت بڑی خوشی ہوئی جب اس کی بیوی اُرسلا (Ursula) نے مجھے اس کے وعظوں کی کیسٹیں بھیجیں۔

سیاست میں میرے داخلے نے میرے مذہبی عقائد کو توسیع بھی دی اور انہیں چیلنج بھی کیا۔ ریاستی سینٹر کی حیثیت سے میرا حلقۂ انتخاب 75000 رائے دہندگان پر مشتمل تھا۔ مجھے ان کے نوع بہ نوع اور اہم مسائل کو حل کرنا ہوتا تھا۔ سینٹر کی حیثیت سے دو مرتبہ مقننہ میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد 1966ء میں مَیں نے گورنر کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ سال جارجیا کا ایک عدیم النظیر اور پیچیدہ سیاسی سال تھا۔ اس برس ڈیموکریٹوں کی طویل عرصے سے قائم چلی آرہی برتری کو چیلنج کیا گیا۔ ریاستی سیاست میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا تاہم ریاستی آئین میں ایک اچانک تبدیلی نے مقننہ کو موقعہ فراہم کر دیا کہ وہ لیسٹر میڈوکس (Lester Maddox) کو حتمی فاتح قرار دے دے۔ وہ ایک نسل پرست کی حیثیت سے بدنام ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی سیاہ فام گاہک اس کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے لیے چلا جائے تو وہ اسے کلہاڑی سے مارنے

Marfat.com

دوڑے گا۔

ہار جانے کے بعد سیاست سے میرا دِل مکمل طور پر اچاٹ ہو گیا، اور پہلی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ میرا عقیدہ ڈانواڈول ہوا۔ مجھے اپنی ذات پر جو یقین و اعتماد تھا، اس میں تزلزل پیدا ہوا نیز میرے مذہبی عقائد بھی کمزور سے پڑ گئے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مجھے زندگی میں طے کردہ بڑے مقاصد کے حصول میں ناکامی ہوئی ہو اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خداوند نے کیسے ایک نسل پرست کو میری ریاست کا چیف ایگزیکٹو بنا دیا تھا۔ میری بہن رُتھ کارٹر سٹیپلٹن (Ruth Carter Stapleton) اس زمانے کی مشہور ایوانجیلسٹ تھی۔ وہ ان انا پسندانہ مغالطوں کو سمجھنے پر قادر تھی، جن کی وجہ سے میں مایوسی و نااُمیدی کا شکار ہوا تھا۔

وہ مجھے ملنے کے لیے نارتھ کیرولینا سے پلینز آئی۔ اس نے مجھے کتابِ مقدس کے اسباق یاد دلائے کہ المیوں اور ناکامیوں کو تحمل، مضبوطی، دانش اور ہماری عیسائی زندگی سے وابستگی میں اضافے کا باعث ہونا چاہیے۔ پہلے تو مَیں نے اس کی باتوں کو قبول نہیں کیا لیکن آخرِ کار رُتھ نے مجھے اپنے سیاسی اور کاروباری عزائم کو کچھ عرصے کے لیے ثانوی اہمیت دینے اور چند چیلنجنگ مذہبی وعدوں کی تکمیل کرنے پر قائل کر لیا۔

جلد ہی میں اس کام میں مصروف ہو گیا جسے بیپٹسٹ ''پائینیر مشن'' (Pioneer Mission) کہتے ہیں۔ مجھے پہلی مرتبہ لاک ہیون پینسلوانیا میں تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پتا چلایا گیا تھا کہ اس علاقے میں سو گھرانے ایسے ہیں جو کسی قسم کا مذہبی عقیدہ نہیں رکھتے۔ مجھے اور ایک دوسرے رضا کار کو ان تمام لامذہبوں (Nonbelievers) سے ملاقاتیں کر کے انہیں اپنے عیسائی عقیدے سے روشناس کرانا تھا۔ ابتدا میں ہمیں تشکیک اور بزدلی نے گھیرا ہوا تھا لیکن جلد ہی ہم نے اپنی فہرست میں موجود ہر گھر یا اپارٹمنٹ تک کامل یقین کے ساتھ پہنچنا سیکھ لیا۔ ہم نے پہلے سے طے کر لیا کہ ہم نے کیا کرنا اور کہنا ہے۔ ہم نے ذمہ داریاں بانٹ لیں، دیر تک عبادت کی اور پھر باقی سب کچھ خداوند پر چھوڑ کر آرام کرنے لگے۔ ہمیں کچھ چیلنجنگ ایڈونچرز سے گذرنا پڑا جن میں لحیم شحیم مزدوروں، کاروباری منتظمین، پکے دہریوں

Marfat.com

اور حد تو یہ ہے کہ ایک چھوٹے وئیر ہاؤس کی میڈم سے ملاقات بھی شامل تھی۔ تاہم ہماری کوششوں کا مجموعی نتیجہ مسلسل غیر معمولی کامیابیوں کی صورت میں نکلا۔

میں ایسے ہی ایک اور مشن پر سپرنگ فیلڈ، میسا چوسیٹس گیا، جہاں مجھے ہسپانوی بولنے والے گھرانوں کو عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھی۔ ان ہسپانوی بولنے والے گھرانوں میں سے بیشتر پورٹوریکو سے آئے ہوئے تھے۔ وہ بہت ہی غریب لوگ تھے۔ وہ ایک متروک ٹیکسٹائل مِل کے نزدیک واقع ایک پرانی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ نزدیک واقع سبزیوں کے کھیتوں اور شیڈوں میں اگائے ہوئے تمباکو کے کھیتوں میں تارکینِ وطن مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس مرتبہ میرا ساتھی ایک کیوبائی امریکی (Cuban-American) ایلائے کروز تھا۔ وہ بروکلین، نیویارک کے ایک چھوٹے چرچ کا پیسٹر تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے اس لیے چُنا گیا تھا کہ میں اینا پولس میں ہسپانوی پڑھ چکا ہوں۔ تاہم جلد ہی ہمیں ادراک ہو گیا کہ میں جتنے الفاظ جانتا تھا اور نیوی میں استعمال کرتا تھا، وہ ان الفاظ سے بالکل مختلف تھے جن کو اب ہم بائبل کی تبلیغ کے لیے استعمال کر رہے تھے!

میں ہر دورے میں بائبل کی منتخب عبارتیں پڑھتا جبکہ ریورنڈ کروز باقی ساری تبلیغ کرتا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا کہ وہ کتنے مؤثر انداز میں لوگوں کے دلوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جب وہ یسوع مسیح کے بارے میں گفتگو کرتا تو لوگ بہت زیادہ جذباتی ہو جاتے اور رونے لگتے۔ وہ انہیں بتاتا کہ کیسے یسوع مسیح کی زندگی اور ان کی زندگی میں مطابقت ہو سکتی ہے۔ مجھے اس غیر معمولی انسان کے ساتھ کام کر کے حیران کن تجربات حاصل ہوئے۔ وہ غریبوں کے گھروں میں داخل ہوتے ہی ان کے ساتھ قریبی تعلق استوار کر لیتا تھا۔ مجھ پر بھی انہی لوگوں جیسے جذبات حاوی ہو جاتے اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنسو میرے رخساروں پر بہنے لگے۔

مجھے اس بے اعتنائی پر شرمندگی ہوتی تھی، جو ریورنڈ کروز مجھ سے روا رکھتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مَیں ایک مقامی امریکی تھا، میرے پاس ایک آٹوموبائل

Marfat.com

تھی اور میں ریاستی سینیٹر رہا تھا۔ جب ہم اپنے مشن کے اختتام پر ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا شے ہے جس نے اسے اتنا مہربان اور مؤثر عیسائی مبلغ بنا دیا ہے؟ میرے سوال پر وہ خاصا جز بز ہوا۔ آخر اس نے ہسپانوی میں جواب دیا، جس کا مفہوم یہ ہے: ''ویل، ہمارا لارڈ انہیں زیادہ نہیں دے سکتا جو سخت ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا کہ خود یسوع مسیح، خداوند کے فرزند ہونے کے باوجود، غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ہمیشہ نہایت مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اس نے مزید کہا کہ وہ ایک سادہ سے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو یوں ہے:

''تمہیں زندگی میں صرف دو محبتوں کی ضرورت ہے: ایک خداوند سے، اور دوسری اس شخص سے جو کسی خاص وقت تمہارے سامنے ہو۔''

میں اپنی شیلفوں میں موجود کارل بارتھ، رائنھولڈ اور ایچ رچرڈ نیبوہر، پال ٹلچ، رڈولف بلٹمین، ڈیٹرچ بونہوفر، ہانس کنگ اور دوسرے الٰہیات دانوں کی کتابوں سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا رہتا ہوں لیکن ایلائے کروز کے سادہ سے لفظوں نے جس گہری اور چیلنجنگ الٰہیات کا اظہار کیا تھا، وہ میرے لیے ان تمام عظیم علماء کی کتابوں سے زیادہ معنویت رکھتی ہے۔

میں نے دوسری کمیونٹیوں میں بھی ایوانجیلیکل کام کیا اور اپنی کاؤنٹ نئی میں بلی گراہم کے ایک کروسیڈ (Crusade) کے مینیجر کی حیثیت سے ایک بہت دلچسپ تجربے سے گذرا۔ چونکہ ایوانجیلسٹ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا تھا، اس لیے ہم نے مذہبی پیغام پیش کرنے کے لیے اس کی ایک فلم استعمال کی۔ ابھی اُس زمانے میں نسلی بنیادوں پر علیحدگی وامتیاز کا رواج موجود تھا، تاہم میں نے گراہم کے اصول کے مطابق مشترکہ پلاننگ سیشنوں اور جلسوں کا اہتمام کیا۔ چونکہ کوئی چرچ ہمیں قبول نہ کرتا، اس لیے ہم نے مجبوراً ایک متروک سکول بلڈنگ میں کمیٹی کی میٹنگیں منعقد کیں اور ایک مقامی سنیما میں فلم دکھانے کا انتظام کیا۔ نتائج حیران کن نکلے۔ سینکڑوں لوگ، بغیر کسی نسلی امتیاز کے، یسوع مسیح کو نجات دہندہ کے طور پر قبول کرنے آئے۔

میرے گورنر منتخب ہونے کے بعد میرا گھرانہ نارتھ سائیڈ بپٹسٹ چرچ کا رکن

Marfat.com

بن گیا۔ یہ چرچ اٹلانٹا میں گورنر کے محل (Mansion) سے سب سے نزدیکی چرچ ہے۔ وہاں میں نے ڈیکن کی حیثیت سے کام کیا اور دوسرے عمومی فرائض بھی ادا کیے۔ واشنگٹن پہنچ کر بھی ہم نے اسی اسلوب کے مطابق عمل کیا اور فرسٹ بپٹسٹ چرچ میں شمولیت اختیار کی۔ میں بھی وہاں سال میں کئی مرتبہ پڑھایا کرتا تھا۔ ان سیشنوں کی پیشگی اشتہار بازی نہیں کی جاتی تھی تاکہ ہمارے سنڈے سکول میں کلاس لینے والے وہی ہوں، جو عام دنوں میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

اپنے آپ کو دہریہ قرار دینے والے ایک شخص کو اپنے عیسائی عقیدے میں دلچسپی لیتے دیکھنا میرے لیے نہایت دلچسپ عمل تھا۔ اپنی صدارت کے پہلے سال مَیں نے پولینڈ کا دورہ کیا۔ وہاں میں نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے سوویت روس کے زیرِ قبضہ قوموں کے درمیان آزادی کے بارے میں عوام سے خطاب کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ ملک کے لیڈر کمیونسٹ فرسٹ سیکرٹری ایڈورڈ گائریک کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نے ایک سابقہ دورے میں پولینڈ کے رومن کیتھولک پری لیٹ (Prelate) سٹیفن کارڈینل وِسزینسکی سے ملاقات کا تذکرہ کیا۔ گائریک نے مجھ سے ایک پرائیویٹ سیشن میں شرکت کا کہا۔ ہم میں کئی مرتبہ میرے عیسائی عقیدے کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ گائریک کی ماں راسخ العقیدہ کیتھولک تھی۔ وہ ویٹیکن جا چکی تھی۔ اس نے پوپ کو بھی دیکھا ہوا تھا۔ گائریک ایک وفادار کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے کمیونزم اور اپنی ماں کے عقیدے کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نجی طور پر تو عیسائی تھا لیکن عوامی سطح پر دہریہ تھا۔

بعد ازاں جنوبی کوریا کے صدر پارک چنگ ہی کے ساتھ اُس کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، امریکی فوجیوں کی تعیناتی اور بین الاقوامی اہمیت کے دوسرے معاملات پر میری گرما گرم بحث ہوئی۔ میں اپنے آخری سرکاری دورے کے بعد صدر کے دفتر سے رخصت ہو رہا تھا تو اس نے پوچھا کہ کیا وہ ایک نجی معاملے کے حوالے سے گفتگو کر سکتا ہے؟ ہم نے اپنے اپنے ماتحتوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ اس نے اپنے دو بچوں کے مذہبی عقیدے کے حوالے سے بتایا۔ ایک بدھ مت کا پیروکار تھا اور دوسرا

Marfat.com

عیسائی تھا۔ اس نے مجھ سے اپنے عقیدے کی تفصیلات بیان کرنے کو کہا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ملاقات کا اختتام اس بات پر ہوا کہ میں کوریا کے ممتاز ترین بپٹسٹ کو اس موضوع پر صدر کو مزید قائل کرنے کا کہوں گا۔ چند ماہ بعد صدر پارک کو جنوبی کوریا کی انٹیلی جنس سروس کے سربراہ نے قتل کر دیا، اور خود اس کی جگہ صدر بن گیا۔ مجھے اس کے ساتھ اپنی مذہبی گفتگو کے آخری نتیجے کا کبھی پتا نہ چل سکا۔

میری سب سے زیادہ دلچسپ اور شاید سب سے زیادہ پیداواری گفتگوئیں چین لیڈر ڈینگ زیاؤ پنگ سے ہوئیں، جن کے ساتھ میں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور عوامی جمہوریہ چین کے عمومی سفارتی تعلقات کے حوالے سے مذاکرات کیے تھے۔ جب ڈینگ زیاؤ پنگ واشنگٹن آئے تو میں نے اور انہوں نے چینی اور امریکی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر وسیع گفتگوئیں کیں، جن کا مقصد دونوں ملکوں کے عوام کے مابین ممکنہ حد تک پختہ دوستی قائم کرنا تھا۔ ایک رات ایک سرکاری دعوت میں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے ان کے ملک سے دلچسپی پہلی مرتبہ کس وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میری پرورش ایک بپٹسٹ کے طور پر ہوئی تھی اور یہ کہ ہمارے اہم ہیروؤں میں وہ عیسائی خواتین لیڈرز شامل ہیں، جو یسوع مسیح کا پیغام پھیلانے مشنری کے طور پر چین گئی تھیں۔ جب میں چھوٹا سا لڑکا ہوتا تھا، اس وقت چینی لڑکے لڑکیوں کے لیے سکول تعمیر کرنے میں مدد دینے کے لیے ہر ماہ پانچ سینٹ چندہ دیا کرتا تھا۔

ڈینگ زیاؤ پنگ میرا جواب سن کر خوش ہوئے اور بتایا کہ جب 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین قائم ہوئی تو اس نوع کی مذہبی سرگرمیوں کو بند کر دیا گیا۔ درحقیقت کمیونسٹوں کے دورِ حکومت میں حکومتی پالیسی لامذہبیت (Athism) کی ہے۔ عبادات اور انجیل اور دوسری مقدس کتابوں کی تقسیم پر پابندی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان پالیسیوں میں تبدیلی لانا ممکن ہے؟ تو انہوں نے مجھ سے اس حوالے سے خصوصی تجاویز مانگیں۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے انہیں تین تجاویز پیش کیں: عبادت کی آزادی کی ضمانت دی جائے، انجیل کو تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے، اور مشنریوں کے لیے دروازہ دوبارہ کھول دیا جائے۔ چین واپسی سے پہلے ڈینگ زیاؤ

Marfat.com

پنگ نے مجھے بتایا کہ مذہبی آزادی مہیا کرنے اور انجیل تقسیم کرنے کی اجازت دینے کے لیے چین کے بنیادی قانون میں تبدیلی لائی جائے گی۔ تاہم انہوں نے مغربی مشنریوں کو دوبارہ تبلیغی سرگرمیوں کے لیے چین جانے کی اجازت دینے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ ''بادشاہوں کی طرح رہتے تھے'' اور انہوں نے چینیوں کے طرزِ زندگی کو خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ تین سال کے اندر اندر انہوں نے اپنے دونوں وعدے پورے کر دیئے۔ اس شرط کے ساتھ کہ ہر نئے چرچ کے اراکین کو حکومت سے رجسٹریشن کروانی ہوگی۔ اس کے بعد وہ اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ عبادت کر سکیں گے۔

میں نے ان تین سیاسی لیڈروں سے اپنی ملاقاتوں کا احوال یہ واضح کرنے کے لیے بیان کیا ہے کہ لامذہب لوگ (Nonbelievers) بھی عیسائیت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ سب گفتگوئیں نجی تھیں، اور مَیں نے ان غیر ملکی حکام کی زندگیوں میں ان کے احترام میں ہر بات کو راز ہی رکھا۔ جب میں سرکاری عہدوں پر فائز تھا، تب روزالِن (Rosalyn) اور میں نے اپنی مذہبی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اسی معیار کے مطابق عمل کیا۔

چند سال پہلے ایک مذہبی جریدے نے ایسے معیارات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی اور مجھ سے کہا گیا کہ میں کامیاب زندگی کی اپنی تعریف (Definition) بیان کروں..........صرف پچاس الفاظ میں! میں جواب لکھنے کے حوالے سے مخمصے میں تھا کہ اچانک مجھے اپنا ایک تجربہ یاد آیا، جس سے مَیں 1974ء میں گذرا تھا۔ تب میں گورنر ہوتا تھا۔ مجھے ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے دعوت دی کہ میں اس کے ساتھ میکن، جارجیا چلوں، جہاں اس کے جریدے گائیڈ پوسٹس کی جانب سے سال کے سب سے اچھے ملکی چرچ کو ایوارڈ دینا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تقریب میونسپل سینٹر میں منعقد ہوگی، جس میں ستر ہزار افراد جمع ہوں گے اور ذہنی طور پر معذور افراد کے ''غیر معمولی چرچ'' کو اعزاز دیں گے۔

مَیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر پیل ایک نہایت دلپذیر تقریر کرنے والے انسان

Marfat.com

ہیں۔ میں نے اپنے خطاب کی تیاری کرتے ہوئے کسی حد تک ان سے مقابلے کا خیال ذہن میں رکھا۔ میں نے اور انہوں نے اپنی بہترین تقاریر کیں۔ پھر مرحلہ آیا آخری ایونٹ (Event) کا، یعنی چرچ کے ایک رکن کے ہاتھوں ایک بڑی شمع کو روشن کیا جانا۔ وہ ایک عورت تھی۔ اسے چرچ کی پیسٹر نے سہارا دینا چاہا، وہ اس سے چند قدم پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس عورت نے سہارا لینے سے انکار کر دیا اور واضح اعتماد اور فخر کے ساتھ شمع تک پہنچی۔

ننھا سا شعلہ آگے پیچھے لہرا رہا تھا اور وہ عورت بار بار کی کوششوں کے باوجود شمع کو روشن نہیں کر پا رہی تھی۔ جلسے کے حاضرین دم بخود بیٹھے تھے جبکہ ڈاکٹر پیل اور میں اس کے لیے شرمندگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ پیسٹر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تاکہ لرزش قابو میں آجائے لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے پرے دھکیل دیا۔

آخرِ کار شمع روشن ہو ہی گئی، اور تمام حاضرین بے تحاشا تالیاں بجانے لگے، تاہم پوری سماعت گاہ (آڈیٹوریم) میں سب سے زیادہ روشن و تابناک چہرہ اس خاتون کا تھا، جو کہ خوشی سے تاباں تھا۔

مجھے یقین ہے کہ آج سے تیس سال پہلے کی اُس رات کسی کو بھی ڈاکٹر پیل کی اور میری نہایت توجہ سے تیار کی ہوئیں تقریروں کا ایک جملہ بھی یاد نہیں ہوگا۔ تاہم کوئی شخص اُس فتح مندانہ لمحے کو کبھی نہیں بھولا ہوگا، کہ جب اُس عورت نے اپنے چھوٹے سے چرچ کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اپنے اعتماد کا مظاہرہ کیا تھا۔

اسی تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے جریدے کے سوال کا جواب پچاس الفاظ میں یوں دیا:

''میرا ایقان ہے کہ زندگی میں ہر شخص کامیابی حاصل کر سکتا ہے، خواہ اس میں اس کے فطری جوہر اور اس کے ماحول کا، کہ جس میں وہ جی رہا ہوتا ہے، کوئی کردار ہو یا نہ ہو۔ اس کامیابی کا پیمانہ دولت، املاک، اثر و رسوخ اور شہرت کے لیے انسان کے مقابلے کی سکت نہیں بلکہ سچ،

Marfat.com

انصاف، عجز و انکسار، خدمت، ہمدردی، عفوودرگذر اور محبت جیسے خداوند کے معیارات ہوتے ہیں۔

وائٹ ہاؤس چھوڑنے کے بعد سے میں تقریباً رُبع صدی تک ایموری یونیورسٹی میں پروفیسر رہا ہوں۔اس دوران میں نے اکثر و بیشتر الٰہیات کے سکول اور مذہب کے شعبے میں لیکچر دیئے، جہاں میں نے الٰہیات سے اپنی واقفیت کو طلباء کے سوالوں کے جواب دینے میں مددگار پایا۔اس کے علاوہ روزالن اور مَیں ہر اتوار پلینز میں اپنے گھر میں گذارتے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ وہاں میں ہر سال بائبل کی 35 سے 40 کلاسیں لیا کرتا تھا، جن میں ہمارے اپنے بالغ اراکین کے علاوہ مہمان بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ کلاسیں میرانیتھا بپٹسٹ چرچ میں ہوا کرتی تھیں۔ ان سیشنوں کی فلم بندی اور ٹیپ ریکارڈنگ کی گئی اور انہیں بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا میرا الٰہیاتی مطالعہ ان ہوم ٹاؤن کلاسز میں مددگار رہا کہ نہیں، البتہ میں نے اپنے والد سے ورثے میں ملنے والے روایتی عیسائی عقائد کے بیان میں کسی بھی قابلِ قبول طریقے سے بھی کبھی کوئی انحراف نہیں کیا۔

میری ہفتہ وار سنڈے کلاسز میں شرکت کرنے والے سینکڑوں مہمان شرکاء میں سے صرف تقریباً 15 فی صد بپٹسٹ ہوتے تھے۔ جب میں اپنی کلاس کو چند منٹ میں اپنا تعارف کرانے کا کہتا تو عموماً نصف درجن ''مین لائن'' (Mainline) پروٹیسٹنٹ فرقوں کے لوگ وہاں موجود ہوتے۔ ان کے علاوہ اکثر رومن کیتھولک، ایمش، مینونائٹس، مورمنز، کوئیکرز اور سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹس بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ ہمارا چرچ یہودیوں، مسلمانوں اور دوسرے غیر عیسائی عبادت گذاروں کو بھی خوش آمدید کہتا ہے اور ہم بحث میں حصہ لینے کے لیے ہر کسی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ میرے لیے بہت دلچسپ اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے گذشتہ برسوں میں بہت سے دوسرے مذہبی لوگوں کے عقائد اور دلچسپیوں کی بصیرت حاصل کی ہے۔

Marfat.com

تیسرا باب

مذہبی بنیاد پرستی کا ابھار

مئی 2002ء میں اوسلو میں امن کا نوبل انعام حاصل کرتے وقت میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا، ''جن لوگوں کی زندگیوں کی صورت گری ہر کسی کے ساتھ مہربانی روا رکھنے کے مذہبی عقیدے کی اساس پر ہوئی ہو، ان کے لیے موجودہ زمانہ مبارزت طلب اور پریشان کن ہے۔'' جب ''کرسچینیٹی ٹوڈے'' نے مجھ سے اس بیان کی وضاحت کرنے کا کہا تو میں نے جواب دیا:

> ''تمام مذاہب میں بنیاد پرستی کی جانب ایک نمایاں میلان ہے .... ہندومت، یہودیت اور اسلام کی طرح عیسائیوں کے تمام فرقوں میں بھی۔ زیادہ سے زیادہ سچے ایمان والے (Believers) فیصلہ کرنے کے ایک عمل کے آغاز کی طرف مائل ہوگئے ہیں: 'چونکہ میں خداوند کی جانب ہوں اس لیے میں برتر ہوں اور میرے عقائد کو غالب ہونا چاہیے۔ جو شخص بھی مجھ سے اختلاف کرتا ہے وہ خلقی طور پر غلط ہے' اس کا اگلا مرحلہ ''خلقی طور پر کمتر'' کا ہوتا ہے۔ آخری مرحلہ ''نیم انسان'' کا ہوتا ہے اور پھر ان کی زندگیاں اہم نہیں رہتی ہیں۔''

بلاشبہ ہمارے ملک میں اور دوسرے ملکوں میں سیاسی لیڈروں اور بڑے مذہبی گروپوں میں بنیاد پرستی کی طرف ایک پریشان کن میلان رہا ہے، اور سیاست و مذہب ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے ہیں، ان میں اختلاط بڑھ گیا ہے۔ میں نے اس تحریک کا اثر اس وقت پہلی بار محسوس کیا جب آیت اللہ خمینی نے ایران کی قیادت سنبھالی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ''شیطانِ بزرگ'' کا خطاب دیا اور اپنے نوجوان عسکریت پسند پیروکاروں کو ہمارے سفارتی عملے کے 52 اراکین کو چودہ ماہ تک یرغمال

Marfat.com

بنائے رکھنے کا حوصلہ دیا[1]۔ یہ شرم ناک اقدام بین الاقوامی قانون کی بلاواسطہ پامالی تھا، نیز انہوں نے اسلامی کتابِ مقدس کی اپنی بنیاد پرستانہ تعبیروں کو اپنی مذہبی لیڈرشپ کی اساس بنایا، وہ بھی قرآن کی امن، ہمدردی اور بالخصوص دوسرے ملکوں کے سفیروں اور مہمانوں سے مہربانی والا سلوک روا رکھنے کی روایتی تعلیمات کے خلاف تھا۔

اگست 1980ء میں جنوبی بپٹسٹ کنونشن کے نومنتخب صدر مجھ سے ملنے اوول آفس آئے۔ اس وقت بھی ہمارا سفارتی عملہ ایران میں یرغمال تھا۔ یہ ملاقات کئی برسوں سے ایک معمول کی تقریب بن گئی تھی، اور اب تو امریکہ کا صدر بھی بپٹسٹ تھا۔ میں نے انہیں ان کی کامیابی پر مبارک باد دی اور ہم نے چند منٹ دعا سلام میں گذارے۔ جب وہ اور ان کی بیوی جانے لگے تو انہوں نے کہا، ''مسٹر پریزیڈنٹ! ہم دُعا گو ہیں کہ آپ سیکولر انسان دوستی کو بطور مذہب کے ترک کر دیں۔'' مجھے تو اس جملے نے ہلا ڈالا۔ میں تو اپنے آپ کو ایک وَفادار اور روایتی بپٹسٹ تصور کرتا تھا اور ان کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔

بعد ازاں فرسٹ بپٹسٹ چرچ میں عبادت کے بعد میں نے اپنے پیسٹر سے ملاقات کی اور ان سے اس پریشان کن تبصرے کی وضاحت چاہی۔ انہوں نے جواب دیا کہ قدامت پسند جنوبی بپٹسٹ لیڈروں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے نئے صدر کے انتخاب کے دوران کنونشن میں انہیں سیاسی مدد مہیا کی تھی۔ میں تو اس واقعے سے ذرا بھی آگاہ نہیں تھا۔ یہ جانے بغیر کہ میرے سوال کا مزید کیا جواب دینا ہے، انہوں نے کہا کہ آپ نے کچھ ایسے صدارتی فیصلے کیے ہیں جو نوتشکیل شدہ ''مورل میجارٹی'' اور دوسرے قدامت پسند عیسائی گروپوں کے سیاسی مؤقفوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ تھی کہ میں نے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بہت سی عورتوں کو فائز کیا تھا، مذہبی تعلیم کے لیے حکومتی فنڈز استعمال کرنے کو رد کر دیا تھا، پبلک سکولوں کو

---

[1] اس پیراگراف میں اور اگلے پیراگرافوں میں بیان کردہ خیالات مصنف کے ذاتی خیالات ہیں، جنہیں اس وجہ سے جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے کہ قارئین کو مصنف کے نظریات سے پوری آگاہی حاصل ہو جائے۔ مصنف کے الفاظ اور خیالات سے مترجم و پبلشر کا متفق ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ (ادارہ)

Marfat.com

بڑھانے کے لیے ایک آزادانہ شعبۂ تعلیم قائم کیا تھا، سپریم کورٹ کے اسقاطِ حمل کے حوالے سے ''رو ورسز ویڈ'' (Roe V.Wade) فیصلے کو قبول کیا تھا، غیر ملکوں میں مورمنز کو درپیش مسائل حل کیے تھے، چین کی کمیونسٹ حکومت کے ساتھ تعلقات کو نارمل بنایا تھا، فلسطینیوں کے وطن کے لیے آواز اٹھائی تھی اور امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے سے انکار کیا تھا، اور ایٹمی اسلحے پر کنٹرول کرنے سے انکار کیا تھا، اور ایٹمی اسلحے پر کنٹرول اور دیگر معاملات پر سوویت یونین کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا۔

میں اور میرے پیسٹر، ہم دونوں مخمصے میں تھے تاہم میرے پاس اِس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ توہین کو نظر انداز کر دوں اور جو کچھ اپنے ملک کے لیے بہترین سمجھوں، وہی کرتا رہوں (جو کہ میرے روایتی بپٹسٹ عقائد سے بھی مطابقت رکھتا تھا)۔ اسی زمانے میں مَیں نے اسلام اور بنیاد پرستی کی قسموں کے بارے میں مطالعہ شروع کیا۔

کئی نسلوں سے ایسا ہے کہ میرے اپنے چرچ اور فرقے کے لیڈر اپنے آپ کو ''بنیاد پرست'' کہتے آئے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ وہ ہمارے بپٹسٹ عقائد کے بنیادی عناصر سے پختہ وابستگی رکھتے ہیں اور جدید دنیا کے دباؤ اور اثرات کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ ''غیر متبدل اصولوں سے ایسی وابستگی'' کا یہ میلان مذہب کا ایک سمجھ میں آسکنے والا اور مہربان پہلو ہے، اور ایک ایسا عمومی رجحان ہے، کہ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر عرصے میں جس کو اپنائے رکھا ہے۔

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ بنیاد پرستی کی ایک اور زیادہ شدید قسم بھی ہے، جس کے کچھ نمایاں خواص ہیں:

☆ تقریباً تمام بنیاد پرست تحریکوں کے سربراہ آمرانہ مزاج کے حامل مرد ہیں، جو خود کو دوسروں سے برتر تصور کرتے ہیں، اور مذہبی گروپوں میں، عورتوں کو کمتر رکھنے کا بے لچک عہد کیے ہوئے ہیں نیز اپنے ساتھی مذہب کے ماننے والوں پر غلبہ پانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

☆ اگر چہ بنیاد پرستوں کا عمومی طور پر عقیدہ یہ ہے کہ ماضی حال سے بہتر ہے، تاہم وہ اپنے تاریخی مذہبی عقائد اور جدید دنیا، ہر دو کے خود کو فائدہ پہنچانے والے پہلوؤں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

☆ بنیاد پرستوں نے اپنے آپ کو سچے ایمان والے قرار دے کر اپنے اور دوسروں کے درمیان واضح امتیاز قائم کر رکھا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ حق پر ہیں اور جو کوئی بھی ان سے اختلاف کرتا ہے وہ جاہل ہے اور شر ہے۔

☆ بنیاد پرست اپنے عقائد کو درپیش ہر چیلنج کا مقابلہ عسکریت سے کرتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر غصہ ور ہوتے ہیں اور اپنے ایجنڈے کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو نہ صرف زبانی کلامی بُرا کہتے ہیں بلکہ انہیں جسمانی نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔

☆ بنیاد پرستوں کا رجحان ہے کہ وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ کرنے کے لیے، جذباتی مسائل اٹھانے کے لیے، اور تبدیلی، تعاون، مذاکرات اور اختلافات رفع کرنے کی دوسری کوششوں کو کمزوری کی علامتیں تصور کرتے ہوئے اپنی تعریف (Definition) کو محدود سے محدود کرتے چلے جاتے ہیں۔

اختصار سے کام لیتے ہوئے اس قسم کی بنیاد پرستی کو تین لفظوں میں سمویا جا سکتا ہے:

1۔ سخت گیری

2۔ غلبہ و تسلط

3۔ علیحدگی

Marfat.com

چوتھا باب

مذہبی لوگوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازعات

اولین عیسائی چرچ کا وجود ہی تفرقہ انگیز مباحثوں کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ان میں سے چند ایک یہ تھے: کیا کسی شخص کو یسوع مسیح کو نجات دہندہ مان کر ان پر ایمان لانے سے پہلے ختنہ شدہ یہودی بننا اور تورات کے قوانین کو ماننا ہوگا؟ کیا مشرکوں کے دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائے جانے والے گوشت کو کھانے کی اجازت ہے؟ ہفتے کے کس دن کو مقدس ماننا چاہیے؟ یسوع کا کون سا حواری یسوع مسیح کی نبوت کا ممتاز ترین شارح ہوگا؟ مثبت عامل یہ ادراک تھا کہ یسوع مسیح کے قریب تر ہونے سے انسانی اختلافات کی اہمیت گھٹ گئی اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یسوع مسیح کی وفات اور آسمان پر اٹھائے جانے کے سات سال بعد 40ء میں عیسائیوں کی تعداد صرف ایک ہزار تھی۔ جب مقامی عیسائی جماعتوں (Congregations) نے قوت پکڑی اور اثر و رسوخ حاصل کیا تو بکھرے ہوئے عیسائیوں پر دوسرے مذہبی لیڈروں اور رومی فاتحین نے ہولناک مظالم ڈھائے۔ اپنے الٰہیاتی اختلافات کو حل کرنے کی کوششوں اور بعد ازاں شہنشاہ کانسٹنٹائن کے طاقتور عیسائی اثر کی وجہ سے تین صدیوں کے اندر اندر عیسائیوں کی تعداد تقریباً تین کروڑ تک پہنچ گئی یا وسیع و عریض رومن سلطنت کے شہریوں کا تقریباً 55 فی صد ہوگئی۔

اب عیسائیوں کی تعداد تقریباً دو اَرب یا دنیا کی آبادی کا ایک تہائی ہے تاہم

Marfat.com

جدید دور کے عیسائیوں میں تفریق اولین دور کے عیسائیوں کی نسبت زیادہ ہے۔ کسی بھی تاریخی دور میں عیسائیوں کا بعض سماجی اور مذہبی معاملات پر نامتفق ہونا، اور ہم امریکیوں کے لیے اپنے ذاتی عقائد کو مذہبی اور سیاسی عمل کے ذریعے ترویج دینا ناگزیر ہے، کاملاً درست اور جائز ہے بلکہ قابلِ تعریف ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ ہمارے اکثر فرقے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں، اور ان میں شاید ہی مسابقت پائی جاتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بیپٹسٹس، میھڈسٹس اور اپسکو پیلینز کے مابین اور حد تو یہ ہے کہ پروٹیسٹنٹس اور کیتھولکس کے مابین بھی کوئی خاص نزاع نہیں ہے۔ تاہم ہر پروٹیسٹنٹ فرقے کے اندر نیز رومن کیتھولکس کے درمیان ایسے بے شمار اختلافات موجود ہیں جنہوں نے عیسائیوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا ہے اور بعض اوقات فرقوں کو مستقلاً اور باقاعدہ طور پر الگ کر دیا ہوا ہے۔

میں ایک ایوانجیلسٹ عیسائی کی حیثیت سے ان تفرقہ انگیز مباحثوں پر متفکر ہوں کہ جنہوں نے ہمارے درمیان اتنے گہرے اختلافات پیدا کر دیئے ہیں۔ ایسے اختلافات جو سب سے زیادہ مشہور ہیں، وہ سماجی مسائل کے حوالے سے رونما ہوئے ہیں۔ تاہم ہمارے بہت سے تنازعات مذہبی حوالہ رکھتے ہیں، جن سے غیر عیسائی لوگوں کو بہت کم دلچسپی ہے۔ ان تنازعات میں شامل ہیں عیسائیوں کی مذہبی پیشوائیت، مقامی چرچوں کی خودمختاری، پیسٹروں کی ملازمت، چرچوں میں عورتوں کا کردار، کیلوزنم، پری ملینیئل ازم، منزہ عن الخطا ہونے کا عقیدہ، عقیدۂ تخلیق، اور ہمارے کالجوں اور سیمی نریز (Seminaries) میں تعلیمی آزادی جیسے زیادہ دنیاوی (سیکولر) مسائل۔

حد تو یہ ہے کہ روزالن اور میں جن لوگوں کے ساتھ چرچ میں عبادت کرتے ہیں، ان میں بھی ایسے حیران کن راسخ العقیدہ عیسائی موجود ہیں جو انجیل کے ہر لفظ کو لفظی طور پر ہی سچ مانتے ہیں۔ (وہ انجیل کے شاہ جیمز والے نسخے کو ترجیح دیتے ہیں)۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خالق نے کائنات کو زمین کے اپنے محور پر چھ بار گھومنے کے دوران تخلیق کیا تھا، اور یہ کہ پہلی عورت تقریباً چھ ہزار سال پہلے ایڈم (Adam) کی پسلی سے

Marfat.com

نکلی تھی، اصلاً دونوں کو ان کی موجودہ انسانی شکل ہی میں تخلیق کیا گیا تھا۔ ہم بغیر کوئی سوال اٹھائے، ان کے اپنے عقیدے سے اخلاص کو قبول کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں پر یہ مسائل بُری طرح چھائے ہوئے ہیں تاہم اس قسم کے معاملات پر بحث و جدل بے ثمر اور غیر پیداواری ہے۔

ہم عیسائی تقریباً ہر موضوع پر اپنے مباحثوں کو اس طرح نرم بنا سکتے ہیں کہ انجیلِ مقدس کی بعض خاص عبارتوں کو احتیاط سے منتخب کر کے دعویٰ کریں کہ ان کا اطلاق ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ عیسائیوں کے درمیان تفریقوں کی بنیاد ایک گروپ کا دوسروں سے برتر ہونے کا مفروضہ ہے۔ سینٹ پال کی بہت سے ہدایات کا احترام بہت مشکل ہے، خود یسوع مسیح کا فرمان ہے: ''فیصلہ مت کرو، تاکہ تمہارا فیصلہ بھی نہ کیا جائے۔'' ان کی ہدایت سے انحراف ہم سے مختلف لوگوں یا کسی طور کمتر تصور کر لیے گئے لوگوں کو نظرانداز کرنے، ان کی توہین اور حد تو یہ ہے کہ ان پر مظالم کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے بپٹسٹ اپنے کنونشن کے صدر کے اس اعلان پر مایوس ہیں کہ خداوند کسی یہودی کی دعائیں نہیں سنتا۔ اب سے کوئی پچیس سال پہلے کچھ عیسائی لیڈروں نے ری پبلکن پارٹی کے زیادہ قدامت پرست وِنگ کے ساتھ ایک اتحاد تشکیل دینا شروع کیا تھا۔ اس طرح کی سیاسی شادی (Political Marriage) میرے چرچ اور ریاست کی علیحدگی کے عقیدے سے متصادم ہے.......... اگر یہ شادی ڈیموکریٹس کے ساتھ ہوگی تب بھی میں ایسا ہی محسوس کروں گا۔

دائیں بازو کے انتہائی منظم عیسائیوں کے لیڈر چند انتہائی متنازعہ و تفرقہ انگیز سماجی مسائل کو امریکہ کے سیاسی مباحثے میں شامل کروانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثالوں میں شامل ہے صنفی ترجیح، جو کہ واضح طور پر شخصی اور جذباتی رنگ رکھتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ تفرقہ انگیز سماجی مسائل صدارتی انتخاب کے منظر پر بھی حاوی کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً تمام پروٹیسٹنٹ اب طلاق کو قابلِ قبول تسلیم کر چکے ہیں، اور شاذ ہی زنا بالرضا یا زنا بالجبر پر تنقید کرتے ہیں حالانکہ ان جنسی افعال کی مذمت یسوع مسیح نے بار بار کی ہے۔ ان گناہوں پر توجہ

Marfat.com

مرکوز کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے جن کے ارتکاب کے حوالے سے ہم معروف نہ ہوں۔

پروٹیسٹنٹوں چرچ کے اراکین اور بالخصوص بپٹسٹوں میں الٰہیاتی مسائل، معاشرتی سوالات یا شخصی جھگڑوں کی وجہ سے تقسیم کا رجحان رہا ہے۔ یہ ہماری بہت زیادہ توسیع کی ایک وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ پلینز میں ہمارا میرانیتھا بپٹسٹ چرچ میرے وائٹ ہاؤس میں خدمات انجام دینے کے دوران اس وجہ سے قائم کیا گیا تھا کہ اسے قائم کرنے والا ایک چھوٹا سا گروپ سیاہ فام عبادت گذاروں کو قبول کرنے اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے سمیت بعض مسائل پر ہمارے سابقہ چرچ سے زیادہ اعتدال پسند تھا۔ تاہم ایسا ابھی تھوڑا عرصہ پہلے ہی ہوا ہے کہ پوری عیسائی دنیا میں الٰہیاتی اور معاشرتی مسائل کو باہم ملا کر شدید تلخی پیدا کر دی گئی ہے جبکہ یہودیوں اور مسلمانوں کے ہاں بھی یہی کچھ اسی طرح سے ہو رہا ہے۔

روزالن اور میں نے وائٹ ہاؤس سے رخصت ہونے کے بعد امریکی زندگی کے مذہبی اور سیاسی شعبوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ شروع کر دیا۔ ہم مذہب و سیاست کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے عمل کو بھی دیکھنے لگے۔ ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ اس انقلاب کا ہم پر اور ہماری قوم پر کتنا گہرا اثر ہوگا۔

ہم اپنے آبائی علاقے کے چرچ کے لیے کام کرنے لگے، جو کہ ہمیشہ جنوبی بپٹسٹ کنونشن سے وابستہ رہا ہے۔ ہم نے قدامت پسندانہ اتحاد کو پہلے کنونشن کے اہم عہدوں کو حاصل کرتے اور پھر کنونشن کے معاملات پر مکمل غلبہ پاتے دیکھا۔ ان کے اگلے اقدامات یہ تھے کہ انہوں نے دوسروں پر اپنے الٰہیاتی فیصلے تھوپنا شروع کر دیا، اور ڈرامائی انداز میں تعلیمی آزادی کو محدود کر دیا۔ اگرچہ میں نے اپنے کنونشن کی چندئی پالیسیوں اور اس کے لیڈروں کی ری پبلکن پارٹی کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت پر افسوس کیا تاہم مجھے مسلسل اُمید یہ رہی کہ بپٹسٹوں کے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں تاکہ ہم مل جل کر عالمی ایوانجیلیکل سرگرمیاں جاری رکھیں۔

جب یہ اختلافات بڑھتے چلے گئے اور دیگر کوششیں ناکامی سے دوچار ہو گئیں تو میں نے کسی نہ کسی درجے کی مصالحت کے مواقع دریافت کرنے کی غرض سے

Marfat.com

اٹلانٹا میں دی کارٹر سینٹر کے دفتر میں بہت سے بااثر بپٹسٹوں کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا۔ حیرانی کی بات ہے کہ تقریباً سبھی مدعوئین نے مجھے مثبت جواب دیا۔ یوں کل ملا کر 30 اعتدال پسند اور قدامت پسند لیڈروں نے اجلاس میں شرکت کی۔ سب نے اس امر سے اتفاق کیا کہ نہ تو ایک دوسرے کے حوالے سے کوئی تنقیدی تبصرہ کیا جائے گا اور نہ ہی اجلاس میں غیر موجود اشخاص پر نکتہ چینی کی جائے گی۔ جب میں نے تجویز دی کہ باہمی احترام اور مشترک مقصد کا ایک مشترکہ بیان فائدہ مند رہے گا تو انہوں نے مجھے اس کا خاکہ تیار کر کے ان کے سامنے پیش کرنے کا کہا۔ تھوڑی قطع و برید کے بعد 26 شرکاء نے دستخط کر دیئے، جن میں سے چھ جنوبی بپٹسٹ کونشن کے صدر رہ چکے تھے یا انہیں آئندہ کونشن کا صدر بننا تھا۔ اس بیان کے متن کی بھرپور تشہیر کی گئی۔

اس بیان میں تسلیم کیا گیا تھا کہ ہمارے درمیان تفرقہ پیدا کرنے والے مسائل موجود ہیں۔ ہم نے انہیں عبادت کے ذریعے دور کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے عہد کیا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھائی، بہنوں والا سلوک روا رکھیں گے۔ ہم نے مذہبی آزادی کو ترویج دینے اور دوسری ثقافتوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کا بھی عہد کیا۔

یہ ایک خوش گوار لیکن نہایت مختصر وقفہ ثابت ہوا کیونکہ زبانی بحث و جدل جاری رہی اور کونشن نے زیادہ تحدیدی پالیسیاں اپنالیں۔ 2000ء میں سالانہ جنوبی بپٹسٹ کونشن کے دوران ایک بڑی اور شاید مستقل تفریق پیدا ہوئی۔ ہوا یہ کہ اس کونشن میں ایک نیا ''بپٹسٹ عقیدہ اور پیغام'' منظور کیا گیا۔ بیشتر بپٹسٹوں کو اس بات پر تشویش ہوئی تھی کہ اس سابقہ معیار کو رد کر دیا گیا تھا کہ ''بپٹسٹوں کے لیے عقیدے اور عمل کی واحد اتھارٹی یسوع مسیح ہیں، جن کا ارادہ کتابِ مقدس میں ظاہر ہوا ہے۔'' درحقیقت مذکورہ تبدیلی کا مطلب یسوع مسیح کی جگہ جنوبی بپٹسٹ لیڈروں کو انجیلِ مقدس کے تعبیر کنندگان قرار دینا تھا۔ اگرچہ وہاں اس امر کا حلفیہ عہد کیا گیا تھا کہ اس نئے بیان کو ماننا رضا کارانہ عمل ہوگا، تاہم جلد ہی واضح ہو گیا کہ اس کا اطلاق ایک لازمی عقیدے کے طور پر کونشن کے افسروں، ملازموں، کالجوں اور سیمی نریز کے ڈینز اور

Marfat.com

پروفیسروں اور حد تو یہ ہے کہ غیر ملکوں میں خدمات انجام دینے والے مشنریوں تک پر ہوگا۔ بے لچک ہونے میں اور سخت گیری میں یہ لازمی عہد رومن کیتھولک چرچ یا دوسرے پروٹیسٹنٹ فرقوں سے بڑھ گیا تھا۔

نیا عقیدہ نہ صرف پریشان کن تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی دیگر تاریخی بپٹسٹ عقائد سے بھی انحراف کیا گیا تھا۔ مثلاً مذہب اور سیاست کو یکجا کیا جانا، تمام پیسٹر مرد ہی مقرر کیے گئے، کنونشن کے معاملات سے روایتی بپٹسٹوں کو نکال دیا گیا، عورتوں کو ثانوی مرتبہ دیا گیا، مقامی چرچوں کی خودمختاری میں دخل دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ نئی بنیاد پرستی کے دیگر عناصر بھی نہایت پریشان کن اور تاریخی بپٹسٹ عقائد سے متضاد و متصادم تھے۔ رفتہ رفتہ یہ امر واضح ہو گیا کہ ہمارے کنونشن لیڈر درحقیقت روایتی یا مرکزی دھارے کے عیسائیوں سے متصادم تھے۔ آخر کافی عبادت اور مراقبے کے بعد روزالن اور میں نے جنوبی بپٹسٹ کنونشن سے اپنے شخصی تعلقات توڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے بپٹسٹ رسوم اور عقائد پر اپنے مقامی چرچ میں عمل کرتے رہے۔

ایک ممتاز قدامت پرست لیڈر ڈبلیو۔ اے۔ کرس ویل نے ایک بیان دیا کہ ''اگر عام لیڈر پیسٹر کی چرچ کے حاکم کی حیثیت سے اتھارٹی کو کمزور کرنے لگیں تو ان کی قیادت غیر انجیلی ہے۔'' اس بیان کی بنیاد پر پیسٹروں کو عام لوگوں پر تقریباً مکمل برتری دے دی گئی۔ یہ بیان یسوع کے اس اعلان کی پامالی تھا کہ وہ ایک خادم ہیں، کہ آپ کے حواریوں کو بھی خادم ہونا چاہیے اور یہ کہ عظیم ترین وہ ہوگا جو سب کا خادم ہو گا۔ اگرچہ لفظ ''حاکم'' سراسر غیر انجیلی تھا، تاہم 1988ء میں پیسٹروں نے خود کو باقاعدہ طور پر یہ منصب دے دیا۔ اب اس کا اطلاق عمومی طور پر پورے جنوبی بپٹسٹ کنونشن، بیشتر ریاستی کنونشنوں اور بالخصوص بڑے چرچوں (Megachurches) پر ہوتا ہے۔

کنونشن کے لیڈروں کا تازہ ترین اقدام یہ ہے کہ انہوں نے بپٹسٹ ورلڈ الائنس (Baptist World Alliance) سے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ جنوبی بپٹسٹ کنونشن نے اس تنظیم کے قیام میں مدد دی تھی اور ایک صدی تک اس میں

Marfat.com

ایک کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کنونشن لیڈروں کا حیران کن دعویٰ یہ ہے کہ بی ڈبلیو اے (BWA) اچانک اتنا زیادہ "لبرل" ہوگیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مزید چلنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک ایسا دعویٰ تھا کہ جس پر ہیرو جیسے کردار روا کرنے والے یورپی عیسائیوں نے سخت غم و غصے کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے سوویت کمیونزم کے جبر و استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور اپنی جانیں داؤ پر لگا کر بھی اپنے روایتی مذہبی ورثے کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔

ہوسکتا ہے بعض قارئین کو میرے اپنے مذہبی فرقے کے داخلی معاملات کو اتنی اہمیت دینا خاص دلچسپی کا باعث محسوس نہ ہو، تاہم اس کا ہر امریکی شہری پر گہرا اثر پڑا ہے کیونکہ ایسی اور اس سے ملتی جلتی تبدیلیاں ہمارے ملک کے سیاسی نظام میں بھی آ چکی ہیں۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران امریکی سیاست میں دائیں بازو کی ایک متوازی تحریک موجود رہی ہے، جس کا بلاواسطہ رابطہ ہم خیال عیسائی گروپوں کے ساتھ رہا ہے۔ نئے انقلابی سیاسی اصولوں میں شامل ہیں: دوسروں کی قیمت پر طاقتور کے لیے خصوصی امداد و حمایت، سماجی انصاف کا نظرانداز کیا جانا، اختلاف کرنے والوں کی تحقیر و تذلیل، ماحول کے تحفظ میں ناکامی، ہاں میں ہاں نہ ملانے والوں کو نکال باہر کرنے کی کوششیں، یک طرفہ سفارتی اقدام کا رجحان نیز بین الاقوامی معاہدوں سے دوری، تصادم کی طرف انتہائی رجحان نیز دوسروں سے بات منوانے کے لیے خوف کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کا انتہائی رجحان۔

جب میں بائبل کلاسوں کو پڑھاتا ہوں تو اپنے عقیدے کے جوہر کی توضیح کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اپنے سامعین کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ عیسائیت کو اپنی روزمرہ زندگی سے جوڑنے پر آمادہ ہوں۔ اگرچہ جدید عیسائی کمیونٹی میں اختلافی مباحث زوروں پر ہیں تاہم میں عموماً ایسے پیغامات چنتا ہوں جو ان اختلافی مباحث سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک اتوار میری کلاس کے شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی، جن میں بیشتر مہمان تھے۔ میں نے ان سے ان کے مختلف فرقوں میں زیادہ زیرِ بحث موضوعات کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فوراً بتایا: سکولوں میں لازمی

Marfat.com

عبادت، مذہبی تعلیم کے لیے سرکاری فنڈز کا استعمال، لیڈروں کی حیثیت سے عورتوں کی سروس (عبادت)، نظریۂ ارتقاء، احکام عشرہ کی عوامی نمائش، مقامی چرچوں کی خود مختاری، عقیدے کی جبری قبولیت، پیسٹروں کی برتری، چرچ اور ریاست کے درمیان سرحدوں کا ختم ہو جانا۔

عالمگیر ایوانجل ازم کے ہمارے مشترک مقصد اور یسوع مسیح کی تعلیمات کے مطابق اپنی روزمرہ زندگیوں کو ڈھالنے جیسے الٰہیاتی اور مذہبی سوالات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ بات واضح ہے کہ ہماری زیادہ تر توانائی فرقہ وارانہ جھگڑوں اور تفرقہ انگیز بحث وجدل میں ضائع ہو رہی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بیشتر مقامی چرچوں میں ہم آہنگی بہت زیادہ اور مسرت بخش سطح پر پائی جاتی ہے، اور یہ کہ بحث وجدل اعلیٰ تر تنظیمی سطح پر ہی ہے۔

جہاں مذہبی کمیونٹی میں فرقہ واریت، غلبہ و تسلط، اور غصہ و نفرت پائی جاتی ہے، وہاں سیکولر اور حد تو یہ ہے کہ حکومتی گروپوں میں بھی یہی رُجحانات موجود ہیں۔ سیکولر افراد اور ادارے بھی ذاتی تعصبات رکھتے ہیں۔

یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ہمارے عیسائی چرچ، کم از کم جنوب میں، نسلی علیحدگی پسندی کے آخری گڑھ کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ اب عورتوں کے خلاف کھلم کھلا اور عموماً امتیاز برتا جا رہا ہے، جو کہ نہایت اشتعال انگیز عمل ہے۔ اس قسم کے مذہبی فیصلوں کی اساس غالب سفید فام مردوں کی طرف سے کتاب مقدس کی منتخب عبارتیں ہیں نیز یسوع مسیح اور اولین عیسائی چرچ کے لیڈروں کی تعلیمات اور اعمال کو فراموش کر دینا ہے۔

عیسائیوں کے درمیان پائے جانے والے بے شمار اختلافات کنفیوژن، تقسیم اور تفرقے کو جنم دیتے ہیں اور انفرادی طور پر مذہب پر عمل کرنے والوں کے لیے ہمارے عقیدے کے بنیادی عناصر کو سمجھنا اور ان پر کار بند ہونا مشکل ہے۔ ان تمام اختلافات کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عالمی ایوانجیلیکل سرگرمیاں بُری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ ہماری ساکھ پر بھی بہت بُرا اثر پڑا ہے کیونکہ ہم آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے

Marfat.com

ہیں۔ حالانکہ اس کے برعکس مذہب کو لوگوں کو علیحدہ کرنے والے اختلافات کو مٹانے کا راستہ دکھانا چاہیے تھا، جس کی اساس وہ عظیم قانون ہوتا جس کی تعلیم ہمیں یسوع مسیح نے دی تھی ....یعنی اپنے ہمسایوں سے ویسی ہی محبت کرنا جیسی محبت ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں۔

شاید سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر آراء نیشنل ایسوسی ایشن آف ایوانجیلیکلز کے اندر امریکی پروٹیسٹنٹوں میں پائی جاتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر نیشنل ایسوسی ایشن آف ایوانجیلیکلز کا بیشتر معاملات میں ہم خیال ہوں۔ زندگی کے تحفظ کے علاوہ ان کے ایجنڈے میں امن، عدم تشدد، خاندانی زندگی کو تقویت دینے، بچوں کے تحفظ، غریبوں اور بے کسوں کے لیے انصاف اور ہمدردی، مذہبی آزادی کے تحفظ، انسانی حقوق کے تحفظ اور ماحول کے تحفظ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اپریل 2005ء میں اپنے تازہ ترین بیان میں انہوں نے صرف ''منصفانہ جنگ'' کو درست قرار دیا نیز مسلح تنازعہ شروع کرنے سے روکا ہے اور جنگ کو تب شروع کرنے کی اجازت دی ہے کہ جب کوئی چارہ کار نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے گلوبل وارمنگ (عالمی درجۂ حرارت بڑھنے) پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے کہ دائیں بازو کے مذہبی لیڈر آخر الذکر دو معاملات پر ایوانجیلیکلز کی اکثریت سے اختلاف رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کے ہاں اس اَمر کی بہت سی سابقہ ادوار کی مثالیں موجود ہیں کہ خداوند کی بادشاہت کو مل کر وسعت دینے کے لیے مضبوط باہمی اختلافات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اولین چرچ کی بقا اسی وجہ سے ممکن ہوئی تھی کہ خطاکار اور بحث وجدل کے عادی عیسائیوں کو عقیدے کی بنیادوں نے اختلافات پر قابو پانے اور متحد ہونے کے قابل بنایا تھا۔ شاید ایک بار پھر ہم یسوع مسیح کے اعمال اور تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر نیز اولین چرچوں کے لیے سینٹ پال کی ہدایت کو مان کر باہمی جھگڑوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ سینٹ پال نے کہا تھا:

> ''بھائیو! اب میں یسوع مسیح کے نام پر تم سے التجا کرتا ہوں کہ سب ایک ہی شے کو تلاشو، تم میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے، تمہیں ایک ذہن

Marfat.com

اور ایک فیصلے کے ساتھ متحد ہو جانا چاہیے۔"

(کورنتھ کے چرچ سے)

"اب تحمل اور مہربانی والا خداوند تمہیں ایک دوسرے کا ہم خیال بنا دے۔ جیسا کہ یسوع مسیح نے فرمایا تھا: تم ایک ذہن اور ایک زبان ہو جاؤ گے تو تم میں خداوند والی شان پیدا ہو جائے گی، جو کہ ہمارے مالک یسوع مسیح کا باپ ہے۔"

(روم کے چرچ سے)

Marfat.com

پانچواں باب

سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے

ایک سب سے پُرانی اور بار بار چھڑ جانے والی بحث، بالخصوص امریکہ میں، سائنس اور مذہب کے درمیان اختلاف کے حوالے سے رہی ہے۔ میں 1960ء کی دہائی کے شروع میں سمٹر (Sumter) کاؤنٹی بورڈ آف ایجوکیشن کا چیئرمین تھا۔ اس زمانے میں مشہورِ زمانہ سکوپس ''بندر'' مقدمہ ٹینیسی میں مسلسل بحث کا موضوع بنا ہوا تھا، حالانکہ اس کو 35 سال گذر چکے تھے۔ ہمیں جارجیا اور دوسری ریاستوں کے سکولوں کے منتظمین کے درمیان نظریہ ارتقاء کو پڑھانے کے حوالے سے جاری بحث وجدل کا علم تھا لیکن ہم نے اس مسئلے پر اپنی کاؤنٹی میں تنازعہ کھڑا نہ ہونے دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پبلک سکولوں میں نسلی امتیاز کے مسئلے نے ہر کسی کو اسی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔

شکر ہے کہ دو متخالف قوتوں کے درمیان یہ تفریق میرے لیے کبھی شخصی یا سیاسی مسئلہ نہیں رہی۔ ایک گریجویٹ طالبِ علم کی حیثیت سے اور ایٹمی توانائی کو پُرامن مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کے اولین حامی کی حیثیت سے میں طبیعیات (فزکس) اور دوسری سائنسوں کے حوالے سے اپنے علم میں اضافہ چاہتا تھا۔ اس سے کسی بھی انداز میں میرے مذہبی عقیدے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بچپن ہی سے انجیل میں متواتر پڑھتا چلا آیا تھا، ''عقیدہ امید کی جانے والی اشیاء کی حقیقت ہے، اشیاء کا ثبوت نہیں دیکھا گیا۔'' (ہیبریوز 1:11)

میں ہمیشہ اس بات کا فہم رکھتا تھا کہ ہمیں خداوند کی ہستی یا کردار کے کسی سائنسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ درحقیقت کسی تھیوری یا مفروضے کو ثابت کرنے

Marfat.com

کے لیے کافی طبیعی ثبوت موجود ہوتا تو پھر ہمیں اپنے مذہب کی اساس کے طور پر عقیدے کی ضرورت نہ ہوتی۔ حد تو یہ ہے کہ جو لوگ کسی خاص مذہب کو نہیں مانتے ان کے لیے بھی درست اور غلط کا داخلی احساس اور ستاروں بھرے آسمان یا غروبِ آفتاب کا مرعوب کن حسن، تتلی کی پیدائش، چیونٹی کی صناعی، یا بیج کا پھوٹنا ہماری زندگیوں اور تخلیق میں خداوند کے ہاتھ کے کافی ثبوت ہوتے۔

مجھے تو یہ امر واضح دکھائی دیتا ہے کہ مجموعی طور پر انجیل خداوند کے روحانی پیغام کو پیش کرتی ہے، لیکن انجیلِ مقدس کے قدیم مصنفین ارضیات، حیاتیات یا فلکیات کے ماہر نہیں تھے اور ان پر خوردبینوں، کاربن ڈیٹنگ ٹیکنیکس (Carbon-Dating Techniques) یا ہبل دوربین استعمال کی رحمت نہیں فرمائی گئی تھی۔ مجھے انجیل کے ان جملوں سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی کہ زمین چپٹی ہے یا یہ کہ اس کے چار کونے ہیں، ستارے آسمان سے زمین پر یوں گرتے ہیں جیسے انجیر درخت سے زمین پر گرتے ہیں، یا یہ کہ دنیا کو کیلنڈر کے چھ دنوں میں تخلیق کیا گیا تھا۔

جب کبھی کوئی سائنسی دریافت عمل میں آتی ہے یا کسی تھیوری کو حقائق کے مشاہدے کے ذریعے ثابت کر دیا جاتا ہے تو یہ ہمیشہ سے موجود صداقتوں کا خطا کار انسانوں پر محض اضافی انکشاف ہوتا ہے۔ یہ دریافتیں اور ثبوت شدہ تھیوریز ساری کائنات کے ہر جگہ موجود خالق کے مرتبے پر کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکتے۔ جب سائنس دان جہانِ فطرت کے بارے میں کوئی نئی اطلاع دیتے یا کوئی نئی دریافت کرتے ہیں تو ان دریافتوں کا اختراعانہ تھیوریز میں ایک دوسری سے ارتباط ضرور ہونا چاہیے۔ پھر ہر تھیوری کو مشاہدات کے ذریعے پرکھا جانچا جاتا ہے، جس سے یا اضافی ثبوت اور قبولیت ملتی ہے یا غلطی کا پتا چلتا ہے اور تھیوری کو ردّ کر دیا جاتا ہے۔ سچ کا انکشاف اسی طرح ہوتا ہے۔

دور واقع لاکھوں کروڑوں کہکشاؤں کے وجود، انواع کے ارتقا، اور بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theory) کو اس وجہ سے مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ انجیل میں ان کا ذکر نہیں آیا ہے، نہ ہی ان کو ماننے سے ہر شے کے خالق پر شک کا سایہ پڑتا

Marfat.com

ہے۔ خداوند نے ہمیں مطالعے اور دریافت کا یہ ولولہ انگیز موقع اس توقع کے ساتھ بالکل نہیں دیا کہ انجیل میں پورے عالمِ طبیعی (Physical World) کا بیان ہو یا یہ کہ سائنسی دریافتوں کا ہمارے عیسائی عقیدے کی بنیاد ہونا ضروری ہے۔

سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں میں سے میرا پسندیدہ مصنف سٹیفن جے گولڈ تھا، جس سے میں اکثر خط کتابت کرتا تھا۔ اس نے 1989ء میں ایک کتاب لکھی، جسے میں اس کی سب سے پر لطف کتاب کہتا ہوں۔ اس کتاب کا عنوان تھا:

Wonderful Life: The Burgess Shale and the Nature of History.

اگرچہ بعد میں بعض ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس کے بعض مفروضوں سے اختلاف کیا، تاہم میں نے پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھا کہ کس طرح تقریباً 50 کروڑ سال پہلے ہیئتیں بدل دینے والی موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے انوکھی مخلوقات وجود میں آئیں۔ اس نے ان کے ارتقا کو مشین سے گزرنے والی ٹیپ سے تشبیہ دی، جس کے نتائج مکمل طور پر اتفاقیہ ریکارڈنگ کے مطابق ہوں۔

میں نے اسے ایک نجی خط لکھا اور اپنے اس عقیدے کے بارے میں بتایا کہ اس عمل میں واضح طور پر کوئی منطق یا نظم (Logic or Order) تھا۔ اس نے براہِ راست جواب نہیں دیا البتہ بعد میں ایک ماہنامے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں، جو بعد میں ایک کتاب کا حصہ بنا، میرے خط سے اقتباس دیا اور میری رائے کا مضحکہ اڑایا۔ 2002ء میں اپنی وفات سے دو سال پہلے اس نے مجھے اپنی کتاب Rocks of Ages کا ایک نسخہ (Copy) بھیجا۔ اس نے اس کتاب میں سائنس اور مذہب کے تنازعے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا فلسفہ دونوں کو مکمل طور پر الگ الگ کرنے کا تھا، جسے وہ "nonoverlapping magisteria" کہتا تھا۔ اس کا مؤقف تھا کہ سائنس کہ عظیم مشاہدات جہانِ فطرت کے معنی بیان کریں گے جبکہ مذہب کی مجموعی تعلیمات (magisterium) روحانی دنیا کے معنی بیان کریں گی، اور ان دونوں کو آپس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

میرے لیے تو یہ ایک قابلِ قبول نظریہ ہے۔ سائنس کے کلاس روم میں

Marfat.com

مذہب کی کوئی جگہ نہیں ہے تاہم یہ نظریہ بعض راسخ العقیدہ عیسائیوں کے چارلس ڈارون کی ارتقا کی تشریحوں یا زمین کو چھ ہزار سال سے زیادہ پرانی ثابت کرنے والی ارضیاتی دریافتوں کو ردّ کرنے کے عہد کو ختم نہیں کرتا۔ نہ ہی گولڈ کا نظریہ میرے اس عقیدے سے مطابقت رکھتا ہے کہ خداوند نے کائنات کو تخلیق کیا، اور یہ کہ جب نئی سائنسی دریافتیں ثابت ہو جائیں تو انہیں لازماً مان لینا چاہیے خواہ وہ انجیل میں زمین کی تخلیق اور مرکزیت اور زمین اور آسمانوں کے باہمی تعلق کے بعض بیانات کے خلاف ہوں۔

ایسے لوگ ہمیشہ موجود ہوں گے جو علم کے ایک رُخ کو دوسرے پر فوقیت دیں گے اور انہیں یہ خبط رہے گا کہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کو ثابت نہیں کر سکتے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ہم سب کو آزاد ارادے کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ ہم جسے چاہیں قبول کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں ردّ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں لوگوں کو اس آزادی سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ صداقتوں کے طور پر پیش کیے گئے مفروضوں کا مطالعہ کریں اور انہیں قبول یا ردّ کریں۔

کئی سال پہلے میں نے ایک نظم کہی تھی، جس سے اس سب کچھ کو سمجھنے میں مجھے پیش آنے والی دشواری کا اظہار ہوتا ہے۔

اس امر پر غور کہ کیا تخلیق کیا گیا اور کیوں

میں نے کمرۂ جماعت کے گھومنے والے ماڈلوں
اور خاکوں کی مدد سے فطرت کے قوانین کو، مالیکیولوں اور ایٹم کے اجزاء کو
سمجھنے کی کوشش کی،

میں ان پر ایمان لانے ہی والا تھا
کہ پھر کوارکس، بوزونز، لیپٹونز، اینٹی پارٹیکلز آ گئے،
الٹے عکسِ آئینہ آ گئے،
زمین میں سوراخ کرنے والے آ گئے،
کبھی اپنے مخصوص راستوں سے نہ ہٹنے والے آ گئے۔

Marfat.com

میں نے عظیم اور کمتر دنیاؤں کے حوالے سے متصادم تصورات کے بارے میں سنا،

میں نے بگ بینگ کے بارے میں سنا، کہ جس سے سب کچھ شروع ہوا،
میں نے خمیدہ، ہمیشہ پھیلتی ہوئی خلا کے بارے میں سنا،
شاید گھومتے ہوئے حیرت ناک یویوز
کہ جو کسی روز کائناتی کششِ ثقل کے اختتام کو پہنچ جائیں گے،
اور پھر وہاں واپس اڑ جائیں گے جہاں سے وہ اڑنا شروع ہوئے تھے
یا پھر قیامت خیز انداز میں تباہ ہو جائیں گے............
اور پھر اور پھر اگلا واقعہ رونما ہوگا،
اور کیا یہ سب ایک حادثہ، ایک اتفاق ہے؟

مجھے یقین ہے کہ یہ سب ایک حادثہ، ایک اتفاق نہیں ہے۔

Marfat.com

چھٹا باب

چرچ اور ریاست کا اختلاط

گذشتہ بیس برسوں کے دوران عیسائی بنیاد پرستوں نے یسوع مسیح کے اس فرمان کو کھلم کھلا چیلنج اور رد کیا ہے: ''قیصر کے کام قیصر پر چھوڑ دو اور خداوند کے کام خداوند پر۔'' بیشتر امریکی اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ عوام سرکاری پالیسی پر اثر انداز ہوں، تاہم وہ اس امر کو درست نہیں سمجھتے کہ کوئی مذہبی گروپ کسی جمہوری حکومت کے کاموں پر کنٹرول پا لے یا سرکاری اہل کار مذہبی معاملات میں دخل انداز ہوں یا کچھ خاص مذہبی اداروں کے حق میں قوانین یا ٹیکس محاصل کو استعمال کریں۔

اگرچہ یہ معاملہ اس وقت بہت نمایاں ہوا تھا کہ جب جان کینیڈی کا کیتھولسزم (Catholicism) بحث کا موضوع بنا تھا تاہم میں نے اپنے صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران بغیر تشہیر کے مذہبی عقیدے کا موضوع دوبارہ متعارف کرایا تھا۔ یہ 1976ء کے اپریل کی ایک رات کا ذکر ہے، میں نارتھ کیرولینا میں اپنے ایک سیاسی حامی کے گھر میں موجود تھا۔ وہاں مجھ سے دوٹوک سوال پوچھا گیا کہ کیا میں ''بارن اگین'' (Born Again) عیسائی ہوں؟ وہاں صحافی بھی موجود تھے۔ میں نے سچا جواب دیا، ''ہاں''، ''ہاں'' یہ قیاس کرتے ہوئے کہ سارے راسخ العقیدہ عیسائی ہولی سپرٹ (Holy Spirit) سے دوبارہ پیدا (Born Again) ہوتے ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مذہب کو سیاسی اکھاڑے میں داخل کیا گیا۔ اس پر فوراً ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ذرائع ابلاغ نے الزام لگائے کہ میں نے آسمان سے براہِ راست پیغامات موصول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور یہ کہ میرا خیال ہے کہ خداوند نے مجھے تقدس کے عناصر عطا کیے ہیں اور دوسرے امیدواروں پر تفوق (Superiority) عطا کیا ہے۔ اس وقت سے لے کر مہم کے اختتام تک قومی صحافیوں نے اس معاملے کو ایک بڑا مسئلہ بنائے

Marfat.com

رکھا جو کہ مجھے اور میرے بپٹسٹ میزبانوں کو فطری معاملہ لگتا تھا۔ اس سے مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا ایک غلطی تھی۔

روزالن کو اور مجھے اِس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرنے کا حیرت ناک موقعہ تب ملا جب 1979ء میں مجھے ویٹ یکن سے ایک استفسار موصول ہوا کہ پوپ جان پال دوم امریکہ کا دورہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں پوپ کو اس عہدے کے لیے منتخب ہوئے ایک سال سے بھی کم عرصہ ہوا تھا۔ میں نے بخوشی انہیں سرکاری دعوت نامہ بھجوا دیا اور وہ کسی پوپ کا واشنگٹن ڈی سی کا پہلا دورہ بن گیا۔ پوپ جان پال دوم جتنے زیادہ پادریوں سے ممکن تھا ملاقاتیں کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے لاطینی امریکی ملکوں کے دورے بھی کیے تھے۔ انہوں نے دو دن امریکی دارالحکومت میں گزارے اور ہمارے درمیان طویل گفتگوئیں ہوئیں۔

ہز ہولی نیس حیران کن حسِ مزاح کے حامل تھے، اور دوسری کئی زبانوں کے علاوہ انگریزی بھی بہت اچھی بولتے تھے۔ ہم نے یاد کیا کہ جب جان کینیڈی صدارت کا انتخاب لڑ رہے تھے تو کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ ان پر الزامات لگائے گئے تھے کہ اگر وہ صدر بن گئے تو امریکی عوام پوپ کو وائٹ ہاؤس میں دیکھیں گے۔ جب میں نے پوپ جان پال دوم کی ملاقات چند مہمان اراکینِ کانگرس سے کرائی تو میں نے کہا کہ پروٹیسٹنٹ احتجاج کنندگان کی انیس سالہ پرانی پیش گوئی آخر سچ ثابت ہوگئی ہے!

میں نے پوپ کی دوسرے عیسائیوں کے علاوہ یہودیوں اور مسلمانوں میں تبلیغ کی کوششوں کو سراہا اور چرچ کو عالمی اہمیت دلوانے کی ان کی جدوجہد کی تحسین کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آزادانہ تبادلۂ خیال کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے عورتوں کو کمتر سمجھنے اور انہیں پادری نہ بنانے کے ان کے فیصلے سے اختلاف کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اوّلین عیسائی چرچ کے لیے ان کے کردار کی توہین ہے۔ وہ ہم آہنگی پر مبنی تبادلۂ خیال تھا لیکن جب ہم نے ''لبریشن تھیولوجی'' (Liberation Theology) کے موضوع پر بات کی تو گفتگو زیادہ درشت ہوگئی۔ مذکورہ موضوع لاطینی امریکہ میں اب بھی سخت بحث وجدل کا باعث بنا ہوا ہے۔

Marfat.com

اُس زمانے میں بیشتر ملکوں پر فوجی آمر حکومت کر رہے تھے اور بے شمار پادری اور بشپ، جنہیں مَیں ہیرو تصور کرتا ہوں، غریبوں، مجبوروں اور مقامی لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھرپور آواز اٹھا رہے تھے۔ پوپ جان پال دوم نے انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں کی مذمت کی اور زیادہ قدامت پرست چرچ لیڈروں کی حمایت کی، جو کہ آمرانہ اور غیر قانونی حکومتوں کے اتحادی تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ مصائب زدہ لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنی زندگیاں اور مذہبی رتبہ خطرے میں ڈال دینے والوں سے زیادہ ویٹ یکن سے وفاداری رکھنے والوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اوپس ڈائی (خداوند کا کام) نامی انتہائی قدامت پرست تنظیم کو ویٹ یکن سے بھرپور تائید وحمایت حاصل ہو رہی تھی۔ اس کے بانی کو بعدازاں سینٹ (Saint) کا درجہ دیا گیا، اور اس کے لیڈروں کو چرچ میں بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہو گیا تھا۔

پوپ کا دفاع کرتے ہوئے میرے قومی سلامتی کے مشیر زبگنیف برزیزنسکی نے کہا کہ پوپ جان پال پر اپنے پولینڈ کے پس منظر کا گہرا اثر ہے، اس کے علاوہ انہیں دوسرے مشرقی یورپی ملکوں کے پادریوں اور بشپوں کے بارے میں بھی علم ہے کہ جو روم سے اختلاف اور کمیونسٹوں کی جانب جھکاؤ رکھتے ہیں۔ بااین ہمہ ویٹ یکن کی اِن اور دوسری پالیسیوں کے نتیجے میں بے شمار کیتھولک پروٹیسٹنٹ بن گئے۔

جب میں اٹلی کے دورے پر گیا تو مَیں نے ویٹ یکن کا دورہ بھی کیا۔ روزالن اور میری بیٹی ایمی نے پوپ سے ملاقات کی اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اگرچہ مجھے پوپ جان XXIII کی الٰہیات اور آراء سے زیادہ قربت محسوس ہوتی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ پوپ جان پال دوم حقیقتاً ایک عظیم لیڈر تھے۔ وہ گہری اخلاقی بصیرت اور دنیا کے سامنے اپنے عیسائی عقائد کے اظہار کی بے مثل اہلیت کے حامل تھے۔ ان جیسا مقبول اور مسحور کن شخصیت کا حامل پوپ اور کوئی نہیں گزرا۔

مَیں صدر کی حیثیت سے اپنے سرکاری مرتبے اور اپنے خاندان کی نجی عبادت کی عادات کو نہایت احتیاط کے ساتھ الگ الگ رکھتا تھا۔ تاہم مَیں نے جنوبی بپٹسٹ کنونشن کے صدر جمی ایلن کے ساتھ پسِ پردہ رہ کر ''بولڈ مشن تھرسٹ'' (Bold

Marfat.com

(Mission Thrust) نامی پروگرام کو شروع کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ اس پروگرام کا مقصد بپٹسٹوں کے لیے عالمی ایوانجیلیکل سرگرمیوں میں توسیع کرنا تھا۔ میں نے زندگی کے ہر دور سے زیادہ عبادت وائٹ ہاؤس کے چار برسوں کے دوران کی۔ اس کا بنیادی مقصد تحمل و بردباری، جرأت اور اچھے فیصلے کرنے کے لیے دانائی کا حصول تھا۔ میں امن کے لیے بھی عبادت کرتا تھا............ اپنے اور دوسروں کے لیے، بالخصوص اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے لیے۔ جب ایران نے ہمارے سفارتی عملے کو یرغمال بنایا ہوا تھا تو میں نے ان کی بحفاظت آزادی کے لیے عبادت کی تھی۔

میری مذہبی کتابوں ''لِونگ فیتھ'' (Living Faith) اور ''سورسز آف سٹرینتھ'' (Sources of Strength) کی اشاعت کے بعد سے مجھ سے پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا کبھی میرے عیسائی عقائد اور صدر کی حیثیت سے میرے دنیاوی (سیکولر) فرائض کے درمیان تصادم پیدا ہوا تھا؟ کچھ معاملات میں ایسا ہوا تھا تاہم میں نے ہمیشہ اپنے اس حلف کا احترام کیا کہ میں ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین کا تحفظ اور دفاع کروں گا۔'' مثال کے طور پر میرا ایمان ہے کہ یسوع مسیح اسقاطِ حمل یا سزائے موت کو کبھی قبول نہ کرتے تاہم میں نے اپنی بہترین اہلیت کے مطابق سپریم کورٹ کے اس نوع کے فیصلوں کی تعمیل کی، اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے خیال کے مطاق ان کے منفی اثرات کو کم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔

یسوع مسیح نے اعلان کیا تھا کہ ان کی نبوت کا مقصد ''غریبوں کو خوش خبری سنانا، قیدیوں کو آزادی عطا کرنا، اندھوں کو بینائی لوٹانا اور مجبوروں کو جبر سے آزاد کرانا'' ہے۔ تمام عیسائی ہمیشہ اس بیان سے آگاہ رہے ہیں، لیکن مَیں مذہبی اور سیاسی ہر دو میدانوں میں اپنے عمر بھر کے تجربے کے بعد ایک ایسے نتیجے پر پہنچا ہوں جسے میرے لیے قبول کرنا مشکل تھا۔ حکومتی عہدوں پر فائز اشخاص اور چرچ کے اراکین غریبوں کی دستگیری کرنے، ان کی تکلیفوں کو دور کرنے، بے گھروں کو گھر فراہم کرنے، غربت اور نسلی امتیاز کو ختم کرنے، امن کے تحفظ، اور قیدیوں کی بحالی جیسے نیک کاموں کو سرانجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔

Marfat.com

حکومت اور چرچ خدمت کی دو مختلف دنیائیں ہیں، اور سیاسی عہدوں پر فائز اشخاص کو مذہبی عقیدے کے اعلیٰ مثالیوں (آئیڈیلز) کے اطلاق اور سرکاری فرائض کی ادائی کے درمیان موجود نہایت لطیف مگر اہم اختلاف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے 1978ء میں اپنے بیپٹسٹ بھائیوں سے خطاب میں صدر اور ایک عیسائی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کے دو رخوں کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی:

تھامس جیفرسن نے ہمارے ملک کے ابتدائی دور میں کہا تھا، انہیں ڈر ہے کہ چرچ ریاست پر اثر انداز ہو کر انسانی آزادی سلب نہ کر لے۔ ہمارے ملک میں پہلا بیپٹسٹ چرچ قائم کرنے والے راجر ولیمز کو یہ ڈر تھا کہ ریاست چرچ میں بگاڑ نہ پیدا کر دے۔ انہی تشویش ناک سوچوں کا نتیجہ پہلی ترمیم کی صورت میں سامنے آیا، جس میں سرکاری ریاستی چرچ کے قیام کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اسی جملے میں مذہبی آزادی میں دخل انداز ہونے والے قوانین منظور کرنے پر بھی امتناع عائد کیا گیا ہے۔

اگرچہ قانوناً (چرچ اور ریاست میں) علیٰحدگی ہے، تاہم ایک مذہبی شخص کے نزدیک ان دونوں کو یکجا کرنا اس لیے غلط نہیں ہے کہ تم مذہبی عقائد کو عوامی خدمت سے خارج نہیں کر سکتے۔ تاہم بلاشبہ تم کسی حکومتی عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے مذہبی عقائد دوسروں پر تھوپ نہیں سکتے۔

مجھے وائٹ ہاؤس میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے دوران بہت سے ملکی اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنا پڑا: امن، آزادی، ایٹمی دھماکے، ہتھیاروں کی فروخت، دہشت گردی، غذا کی کمی اور ناکافی حفظانِ صحت کے باوجود تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی۔ تاہم یہ تو سیاسی مسائل تھے۔ مجھے اپنے اور آپ کے لیے اخلاقی مسائل سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا کیونکہ ان میں ہمارے عقائد بھی شامل تھے۔

Marfat.com

میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ملک فوجی اور ہر دوسرے اعتبار سے اتنا طاقتور ہو جائے کہ ہمیں کبھی یہ ثابت نہ کرنا پڑے کہ ہم طاقتور ہیں۔

رائنہولڈ نیبوہر نے اپنی کتاب ''مورل مین اینڈ اِم مورل سوسائٹی'' (Moral Man and Immoral Society) میں معاشرے اور لوگوں کے درمیان موجود اختلاف کی نشان دہی کی ہے۔ کسی شخص کی توقعات ایک بہت اونچا معیار ہوتی ہیں۔ انسان کو ایثار کیش محبت کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ ہم معاشرے سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف انصاف قائم کرے۔

پس عوام کی حیثیت سے ہمیں بہتر کام کرنا ہوگا، بالخصوص اس صورت میں کہ ہمیں اپنی وقعت ظاہر کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ لیڈروں کو بھی محتاط ہونا پڑے گا لیکن بزدل نہیں۔

..........کوئی ملک اپنی فوجی قوت سے نہیں بلکہ اخلاقی عوامل کے ذریعے اتھارٹی اور اثر و رسوخ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انکسار اپنا سکتا ہے اور تکبر سے بچ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عوام اور ہمارے ملک دوسروں پر غلبہ و تسلط پانا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ جو قوم اخلاقیات سے عاری ہوتی ہے وہ جلد ہی دنیا میں اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھتی ہے۔

کسی فرد یا فرقے یا ملک کے مقاصد کیا ہوتے ہے؟ سب غیر معمولی حد تک یکساں ہوتے ہیں: امن کی خواہش، انکسار کی ضرورت، اپنی غلطیوں کا جائزہ لینا اور ان سے بچنا، وسیع ترین معنوں میں انسانی حقوق سے وابستگی جن کی اساس محرومی، نفرت، بھوک، جسمانی تکلیفوں کی وجہ سے رونما ہونے والے عذاب کو مٹانے کی فکر کرنے والا اخلاقی معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے آئیڈیلز اور اپنے عقیدے کو دوسروں تک پہنچانے، انسان میں موجود محبت کو انصاف میں بدلنے کی رضامندی،

Marfat.com

بلکہ اشتیاق ہونا چاہیے۔''

میرے محولہ بالا خطاب کے بعد کے ستائیس برسوں کے دوران تھامس جیفرسن کی اصطلاح میں ''چرچ اور ریاست کے بیچ کھڑی علیٰحدگی کی دیوار'' کو گرانے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں۔

700 کلب کے میزبان پیٹ رابرٹسن (Pat Robertson) نے مذکورہ بالا اصطلاح کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا، ''آئین میں ایسی کوئی شے موجود نہیں ہے۔ یہ بائیں بازو والوں کا جھوٹ ہے، ہم اس پر مزید اعتبار نہیں کریں گے۔'' اس نے پبلک سکولوں پر مسلسل تنقید کی اور کہا کہ ان کی جگہ مذہبی اکادمیاں (Religious Academies) کھولی جائیں۔

چیف جسٹس ولیم رینکوئیسٹ نے امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلے میں اقلیتی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا، ''چرچ اور ریاست کے بیچ کھڑی علیٰحدگی کی دیوار ایک استعارہ ہے، جس کی اساس بُری تاریخ ہے، ایک ایسا استعارہ جو فیصلے کرنے کے لیے رہنمائی دینے میں کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ اسے بلا تکلف اور واضح طور پر ردّ کر دیا جانا چاہیے۔''

2000ء میں جنوبی بپٹسٹ کونشن کے لیڈروں نے اپنے اصولوں میں سے اس اصول کو نکال دیا، ''ریاست مذہب کی کسی بھی صورت (Form) کی مدد کے لیے ٹیکس عائد کرنے کا حق نہیں رکھتی۔'' اس کے بعد انہوں نے پرائیویٹ سکولوں کے لیے واؤچر بنائے اور پبلک سکولوں میں عبادت کو لازمی قرار دینے کے لیے آئین میں ترمیم کا مطالبہ کیا اور چرچ اور ریاست کی علیٰحدگی کو کھلم کھلا چیلنج کرنے لگے۔

''مذہب کی بنیاد پر پہل'' کے ذریعے سماجی پروگراموں کی حکومتی فنڈنگ کو تو مذہبی گروپوں نے پسند کیا لیکن ان کے ضمیر کو اس اَمر پر ذرا بھی خلش محسوس نہیں ہوئی کہ مذہب اور حکومت کے درمیان استوار تاریخی دیوار ٹوٹ رہی ہے۔ انہوں نے معاشی انصاف کی غریبوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زیادہ وسیع اور مساویانہ حکومتی پروگراموں کے لیے مذہبی ماحول میں خاص خیراتی سروسز کا اجرا کیا تا کہ غریبوں

Marfat.com

کو روزگار کے لیے تربیت دی جائے، گھر مہیا کیے جائیں، ان کی صحت کے مسائل حل کیے جائیں، انہیں تعلیم مہیا کی جائے اور اچھی اُجرت دی جائے۔ یہ اقدامات ٹیکس دہندگان کے ڈالروں کا بہاؤ گرجا گھروں کی طرف کر کے پہلی ترمیم سے تجاوز کر رہے ہیں۔ وہ پہلی ترمیم کے تاریخی اطلاق کو مسخ کر کے مذہب کی بنیاد پر سماجی خدمات انجام دینے والوں کو ٹیکس دہندگان کی رقوم سے فنڈز دلوا رہے ہیں۔ واضح ہو کہ ایسے ادارے جن قوانین کے تحت کام کر رہے ہیں وہ ملازمت کے لیے لوگوں کا اصل مذہب بدلوا کر ان سے عیسائیت قبول کرانے اور امیدواروں کا مذہبی ٹیسٹ لینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ٹیکس دہندگان کی رقم سے نئے گرجا گھر تعمیر کیے گئے اور پرانے گرجا گھروں کی تزئینِ نو کی گئی۔ اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کا مقصد واضح طور پر مذہبی پروگراموں کے لیے سرکاری مالی امداد کا حصول ہے۔ یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ حکومت کی طرف سے مذہبی اداروں کی سالانہ امداد دو ارب ڈالر ہو چکی ہے۔

شاید دائیں بازو کے عیسائیوں کا سب سے عجیب اور سب سے زیادہ پریشان کن سیاسی اقدام وفاقی عدالتی نظام پر براہِ راست تنقید ہے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ سینیٹ میں موجود ڈیموکریٹس انتہائی قدامت پرست افراد کو وفاقی جج بنوانے میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ ری پبلکنوں نے بل کلنٹن کے نامزد کردہ اتنے ہی افراد کی کامیاب مخالفت کی تھی۔ امریکی سینیٹ کے ایک اعلیٰ ترین درجے والے رکن سینیٹر بل فرسٹ نے ایک ٹی وی پروگرام میں ایک بنیاد پرست مذہبی گروپ سے تعلق کا اعلان کیا اور چند ججوں کے تقرر کی مخالفت کرنے والے ڈیموکریٹوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے ''مذہبی لوگوں پر حملہ'' کیا ہے۔ گروپ کے لیڈر نے بانگ دہل کہا کہ ''ایکٹوسٹ'' عدلیہ ''نمائندہ حکومت کے لیے دہشت گرد گروپوں سے بڑا خطرہ ہے۔'' اسی پروگرام میں ڈاکٹر جمیز ڈوبسن نے سپریم کورٹ کو ''احتساب سے بالا'' ''کنٹرول سے باہر'' اور ''ایک مستبدانہ ادارہ'' قرار دیا اور جسٹسوں پر الزام لگایا کہ وہ چالیس سال سے ''مذہبی آزادی کو محدود کرنے کی مہم'' چلا رہے ہیں۔ (بعد میں ایک پریس کانفرنس میں صدر جارج ڈبلیو بش نے وفاقی ججوں کے تقرر کی مخالفت

Marfat.com

اور مذہبی عقیدے کے مابین تعلق کو رد کیا)۔

درحقیقت جن ججوں پر اتنا منظم حملہ کیا گیا، ان میں سے بیشتر راسخ العقیدہ عیسائی ہیں۔ تیرہ میں سے گیارہ وفاقی اپیلز کورٹس میں درحقیقت ری پبلکنوں کے نامزدگان کی اکثریت ہے، اور یہی صورتِ حال سپریم کورٹ کی ہے، جس نے 2000ء میں چار کے مقابلے میں پانچ جماعتی رولنگ سے ایک صدر منتخب کیا۔ سینیٹر فرسٹ اس مفروضے کو تقویت دینے میں مدد کر رہے تھے کہ جن سینیٹروں نے انتہائی قدامت پرست نامزدگان کے خلاف ووٹ دیئے، وہ دائیں بازو کے ریاستی مذہب کے خلاف ہیں۔ یہ امریکی آئین کی خلاف ورزی ہوسکتی ہے، کم از کم معنوی خلاف ورزی، جو کہ حکومت کو امریکیوں پر کوئی مذہبی نظریہ تھوپنے سے روکتا ہے۔

جولائی 2005ء میں سپریم کورٹ کی جسٹس سانڈرا ڈے اوکونر نے اپنی ریٹائرمنٹ کے اعلان کے فوری بعد کہا تھا، ''مَیں نے اپنی ساری زندگی میں کانگرس کے اراکین اور عدلیہ کے تعلقات کو اتنا داغدار کبھی نہیں دیکھا، جتنا کہ اب ہیں .... اور مَیں یہ دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہوں۔ موجودہ فضا ایسی ہے کہ مَیں وفاقی عدلیہ کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوں۔''

کچھ ممتاز ری پبلکن بھی اپنی سیاسی پارٹی میں مذہبی گروپوں کے غیر معمولی اثر ونفوذ پر بہت فکرمند ہیں۔ جان ڈینفورتھ نے، جو کہ امریکی سینیٹ میں مسّوری کی نمائندگی کرنے سے پہلے ایک اپسکوپل پادری تھے، نیویارک ٹائمز (اپریل 2005ء) میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا:

> ''اب ری پبلکنوں نے ہماری پارٹی کو قدامت پرست عیسائیوں کا سیاسی بازو بنا دیا ہے۔ اس تبدیلی کے عناصر ایک بڑے پروگرام کا، ایک ایسے ایجنڈے کا حصہ ہیں جس کے مؤقف قدامت پرست عیسائیوں اور ری پبلکن پارٹی کے غالب وِنگ کے موقفوں سے مطابقت رکھتے ہیں .... مسئلہ سیاسی طور پر فعال افراد یا چرچوں کا نہیں ہے۔ یہ تو ایک پارٹی کا مسئلہ ہے جو ایک فرقہ وارانہ ایجنڈا اپنانے

Marfat.com

میں اتنا آگے چلی گئی ہے کہ ایک مذہبی تحریک کی سیاسی توسیع بن گئی ہے ....ایک سینیٹر کی حیثیت سے میں وفاقی خسارے کی مالیت پر دن رات متفکر رہتا ہوں۔ مجھے شادی کے رواج پر ہم جنس پرستوں کے اثرات کے حوالے سے لحہ بھر کے لیے بھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ آج کی صورتِ حال الٹ لگتی ہے۔''

یہ اَمر واضح ہے کہ بنیاد پرست عیسائیوں کو ری پبلکن پارٹی کے دائیں بازو میں شامل کرنے کے لیے ایک انتہائی احتیاط سے تیار کیے گئے منصوبے کے تحت ہمہ گیر کروسیڈ دونوں اطراف سے جاری ہے۔ اگرچہ بعض امریکی ایسا چاہتے ہیں تاہم چرچ اور ریاست کا اختلاط وادغام ان لوگوں کے لیے گہری تشویش کا باعث ہے، جنہوں نے چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو امریکیوں کی ایک اخلاقی قدر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

Marfat.com

ساتواں باب

طلاق اور ہم جنس پرستی کے گناہ

بعض اوقات ہم سارے عیسائی انجیل کی ان عبارتوں کو بھلا دیتے ہیں: ''سب نے گناہ کیے اور سب کو خداوند نے اپنی شان سے محروم کر دیا'' اور ''فیصلہ مت کرو، تا کہ تمہارا فیصلہ بھی نہ ہو۔'' اب یہ ایک مزاحیہ واقعہ لگتا ہے لیکن میں اسی قسم کی انجیلی عبارتوں کی وجہ سے صدارتی انتخاب تقریباً ہار چکا تھا۔ میں اپنے اس ردِ عمل پر خود اپنی مایوسی کو نہیں بھلا پاؤں گا جو میں نے 1976ء کی صدارتی مہم کے دوران ''پلے بوائے'' کے رپورٹر کے ایک سوال کے جواب میں ظاہر کیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا میں ایک عیسائی کی حیثیت سے خود کو دوسرے امریکیوں سے برتر و اعلیٰ تصور کرتا ہوں۔ میں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے یسوع مسیح کے پہاڑی پر وعظ کے کچھ جملوں کا حوالہ دیا، جن میں آپ نے دل میں نفرت رکھنے اور قتل ہو جانے والوں، اور زانیوں اور عورتوں کو ہوس بھری نظروں سے دیکھنے والوں میں فرق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مَیں نے زنا کے ارتکاب سے انکار کیا البتہ یہ کہا کہ میں نے اپنی چند شناسا لڑکیوں کے لیے جنسی خواہش محسوس کی تھی۔ میرے سیاسی مخالفوں اور مشہور چرچ لیڈروں نے میری ''ہوس'' کی وجہ سے مجھ پر تنقید کے شعلے برسانے شروع کر دیئے اور ایک ہفتے کے اندر اندر میں عوامی رائے کے سروے میں دس پوائنٹ کھو بیٹھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے بنیاد پرستوں کی ایک دلچسپ خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک یا دو جذباتی مسائل پر جنون کا شکار ہوتے ہیں جیسا کہ کچھ مذہبی دھڑے ہم جنس پرستی پر۔ بہت سے راسخ العقیدہ عبادت گذار ایسے ہیں جو ہم جنس پرستوں کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کے جنسی رشتے کو اپنی مذہبی دعا دینے سے انکار کرتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے گروپوں نے مرد اور عورت ہم جنس پرستوں کو تحقیر و تذلیل کا سب سے

Marfat.com

بڑا ہدف بنا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی بپٹسٹ کنونشن کے لیڈروں نے ہم جنس پرستی کو اپنی عیسائی عقیدے کی جامد اور تنگ سے تنگ ہوتی ہوئی تعریف کی روشنی میں کجرویوں میں سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔

ایک اس سے بھی زیادہ پریشان کن دعویٰ یہ ہے کہ ایچ آئی وی/ایڈز (HIV/AIDS) ان لوگوں کے لیے خداوند کی سزا ہے جنہوں نے گناہ کیے ہیں اور ان کے ساتھ گناہگاروں جیسا سلوک کیا جانا چاہیے۔ یسوع مسیح کوڑھیوں سے اچھا سلوک کرتے تھے حالانکہ انہیں بھی گناہ گار تصور کر کے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، انہیں خداوند کے دھتکارے ہوئے اور اپنے ہمسایوں کو بیمار کر دینے والا تصور کیا جاتا تھا۔ یسوع مسیح نے ان سے محبت کر کے، انہیں صحت دے کر ہمارے لیے ایک مثال قائم کی تھی۔ تقریروں کے شوقین چند مذہبی لیڈر ہم جنس پرستوں کی عوام میں تحقیر و تذلیل کرتے اور ان کا مضحکہ اڑاتے رہے ہیں۔ اس رجحان کی سیاسی قبولیت نے اس کو مصدقہ پن عطا کیا ہے اور اس امتیاز کو بڑھاوا دیا ہے۔

مجھے یاد ہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر ٹاورز پر 9/11 کے دہشت گردانہ حملے کے فوری بعد جیری فال ویل نے کہا تھا، ''مجھے یقین ہے کہ کافروں، اسقاطِ حمل کے حامیوں، نسائیت پسندوں، اور عورت مرد ہم جنس پرستوں کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا ہے۔'' پیٹ رابرٹسن نے، جو کہ ''700 کلب'' نامی ٹیلی ویژن پروگرام کا میزبان تھا، اس سے فوراً اتفاق کیا۔

دوسرے زیادہ اعتدال پسند عیسائی افراد اور فرقے بھی ہم جنس پرستی کے مسئلے پر خفگی کا اظہار کرتے ہیں تاہم وہ مذکورہ بالا افراد کی طرح ان کی شخصی تذلیل نہیں کرتے، نہ ہی انہیں عیسائی دعا سے خارج کرتے ہیں۔ انہیں غصہ صرف اس بات پر ہے کہ چرچ نے ہم جنس پرستوں کو پادری کیوں مقرر کیا ہے۔ نیز ہم جنس پرست جوڑوں کے مابین شادی کیوں کروائی ہے۔

اگرچہ یسوع مسیح نے کامل زندگی سے انحرافات کی اپنی بڑی سخت فہرست میں ہم جنس پرستی کو بالکل شامل نہیں کیا، لیکن سینٹ پال نے اسے اپنی طویل فہرست میں

Marfat.com

ضرور شامل کیا ہے، تاہم انہوں نے ہمیشہ احتیاط روا رکھی کہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرنے کو بُرا کہا، اور جیسا کہ ہم سب عیسائی جانتے ہیں، سینٹ پال نے مسلسل کہا کہ ہم سب گناہ گار ہیں، اور گناہ کی سزا موت ہے، لیکن یسوع مسیح پر ایمان لا کر ہمیں مکمل معافی مل سکتی ہے۔

جنوبی بپٹسٹ کنونشن کے آخری اعتدال پسند صدر ڈاکٹر جمی ایلن میرے عیسائی ہیروؤں میں سے ایک ہیں۔ ان کا خاندان ایڈز کی تباہ کاریوں سے شدید متاثر ہوا۔ بپٹسٹ گرجا گھروں نے ان کے ایڈز سے متاثر افرادِ خاندان کو ردّ کر کے انہیں سخت تکلیف دی۔ وہ کہتے ہیں، ''ہمارا مسئلہ گناہ کی تعریف (Definition) نہیں، بلکہ مہربانی کا فہم ہے.......... اگر ہم کسی شخص سے سچی محبت کرتے ہوں تو اس کے انحرافی رویے سے نباہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں گناہ سے نفرت اور گناہ گار سے محبت کرنی چاہیے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسے متوازن انجیلی مؤقف کو نہ تو ہم جنس پرست متفقہ طور پر سراہیں گے اور نہ ہی ''سیدھی'' (Straight) کمیونٹی متفقہ طور پر قبول کرے گی۔ تاہم اگر ہم یسوع مسیح جیسی محبت کرنا سیکھ لیں تو جو لوگ اہم ہیں، وہ کہیں گے، ''بہت خوب، اچھے اور فرمانبردار خادم۔''

میرا خیال ہے کہ عیسائی فرقے ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کے حوالے سے چھڑی ہوئی بحثوں کو مکمل طور پر کسی حل تک نہیں پہنچا سکتے۔ البتہ اس اَمر میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مسئلہ ہم میں یا ہمارے ملک میں سیاسی میدان میں گہری تقسیم پیدا کر دے گا۔ درحقیقت سیاسی پارٹیوں کی رائے میں بھی اس مسئلے پر کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ 2004ء کے صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران صدارت کے دونوں امیدواروں نے ہم جنس پرستوں کی شادی کی مخالفت کی تھی، تاہم قانونی طور پر تسلیم شدہ یونینوں کے ذریعے مرد اور عورت ہم جنس پرست جوڑوں کو مساویانہ شہری حقوق دینے کی منظوری دی تھی۔ اس اَمر پر اتفاق کے باوجود صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران اس نان ایشو پر گرما گرم بحث جاری رہی اور چند سیاسی فتنہ پردازوں نے اسے سب سے نمایاں کیے رکھا۔ یہ سیاسی فتنہ پرداز امریکی آئین میں ترمیم کے ذریعے شادی

Marfat.com

کی تعریف متعین کروانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ مطالبہ سیاسی اعتبار سے ناممکن العمل ہے تاہم اس سے یہ مسئلہ اخلاقی اقدار کے جذباتی مباحثے میں تقریباً سب سے نمایاں رہتا ہے۔

چونکہ عیسائی دور میں نیز زیادہ قدیم ادوار میں زنا کی سزا موت ہوا کرتی تھی اور چونکہ خود یسوع مسیح نے زنا اور طلاق کی سخت مذمت کی تھی اس لیے زیادہ انجیلی استناد کے ساتھ آئین میں ترمیم یوں ہو سکتی ہے: ''زنا اور طلاق کی مذمت کی جاتی ہے، اور شادی کی تعریف یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایک قانونی اور روحانی بندھن جو موت کے ان کو الگ الگ کر دینے تک برقرار رہے گا۔'' امریکیوں کی واضح اکثریت طلاق کو تسلیم کرتے ہوئے اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ یہ ہم جنس پرستوں کے لیے ان کے ہم جنسی رویے کو جاری رکھنے میں مددگار ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول ہوگی، شاید آئین ہی سے دور ہو جانے کو بہتر سمجھیں گے۔

ہم سب خاندانی اقدار اور شادی کی روایت کے استحکام کو انتہائی اہم تصور کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کالج پہنچنے سے پہلے تک میں کسی طلاق یافتہ شخص سے واقف نہیں تھا، تاہم اب طلاق خطرناک حد تک عام ہو چکی ہے۔ تمام امریکی بالغوں میں سے 25 فی صد کو کم از کم ایک مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ طلاق کی تعداد میں کمی بیشی مذہبی وابستگی اور عمر کی مناسبت سے مختلف ہے۔ بڑے عیسائی گروپوں میں سے بپٹسٹ سب سے اوپر ہیں .... 29 فی صد جبکہ کیتھولک اور لوتھرن طلاق یافتگان 21 فی صد ہیں۔ ایشیائیوں کے استثنا کے ساتھ (صرف 9 فی صد) پروٹیسٹنٹوں کے سینئر پیسٹر سب سے کم طلاق یافتہ گروپ تھا (15 فی صد)۔ بے بی بومرز[1] (Baby Boomers) 34 فی صد کو پہنچ چکے ہیں، 53 سال سے 72 سال کی عمر کے درمیان کسی عمر والے افراد 37 فیصد جبکہ زیادہ بوڑھے افرد میں صرف 18 فی صد طلاق یافتہ ہیں۔ شادی کے تقدس

---

[1] امریکہ میں 1946ء سے 1965ء کے برسوں کے دوران کسی برس پیدا ہونے والوں کو ''بے بی بومرز'' کہا جاتا ہے۔ ''بے بی بوم'' اصطلاحاً اس دور کو کہا جاتا ہے، جس میں بچوں کے پیدا ہونے کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ امریکہ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ہوا تھا۔ (مترجم)

Marfat.com

کولاحق اس خطرے کی وجوہات بہت سی ہیں لیکن بعض لوگ ہم جنس پرستی کو شادیوں کی ناکامی میں بہت زیادہ اضافے کا ایک اہم سبب تصور کرتے ہیں۔

اس متنازعہ معاملے کو جوں کا توں چھوڑنے کی بجائے ہمیں چاہیے کہ دو بنیادی نکتہ ہائے نظر کو الگ الگ کر لیں اور شہریوں کے لیے مساوی حقوق کے تعین اور ان کا تحفظ حکومت پر چھوڑ دیں، بشمول ''شہری تنظیموں'' کے حقوق۔ دوسری طرف ''مقدس شادی'' کا تعین چرچ پر چھوڑ دیں۔

اپریل 2005ء میں کنکٹی کٹ میں ایک قانون تقریباً کامل اتفاقِ رائے سے منظور کیا گیا، جس کے تحت ہم جنس پرست جوڑوں کو ویسے ہی قانونی حقوق دیے گئے ہیں جو کہ شادی شدہ مخالف جنسی (Heterosexuals) جوڑوں کو حاصل ہیں۔ ان میں خاندانی چھٹی، ٹیکس اور انشورنس فوائد، اور علاج کی سہولت شامل ہیں۔ اس قانون میں شادی کی تعریف یوں کی گئی ہے: ایک مرد اور ایک عورت کا باہمی بندھن۔ یہ چرچ اور ریاست کے درمیان ذمہ داریوں کی منطقی اور سادہ تقسیم ہے، جس کو میں پسند کرتا ہوں۔ ہمارا واحد متبادل یہ ہے کہ غیر ضروری مذہبی تنازعے کو دوام دیں اور اس اَمر کا انتظار کریں کہ امریکی سپریم کورٹ قانونی سوالوں کے حتمی جواب دے۔

Marfat.com

آٹھواں باب

کیا یسوع مسیح اسقاطِ حمل اور سزائے موت کی منظوری دیتے؟

اسقاطِ حمل

امریکہ میں موجود تمام اخلاقی اور سیاسی مباحث میں اسقاطِ حمل کا مسئلہ سب سے زیادہ اختلاف انگیز و تفرقہ خیز ہے۔ مسئلے کے دونوں فریق شدید جذباتی ہیں، اور ہماری داخلہ و خارجہ، ہر دو پالیسیوں پر اثر انداز ہیں۔ ہمارے عیسائی چرچوں میں یہ عمومی اتفاقِ رائے ہے کہ جنین ایک انسانی جان ہوتا ہے اور اس کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔

اسقاطِ حمل کے حوالے سے دو انتہائی نکتہ ہائے نظر کو یکجا کرنا ناممکن ہے۔ ایک فریق کا دعویٰ ہے کہ جنین کے حوالے سے فیصلہ کرنا صرف عورت کا حق ہے کیونکہ یہ اس کے اپنے جسم کا معاملہ ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ انسان حمل ٹھہرتے ہی وجود میں آجاتا ہے لہٰذا جنین کی نشوونما میں مداخلت قتل کے مترادف ہے اور حد تو یہ ہے کہ عورت کی کوکھ میں خارج شدہ سپرم کی بارآوری میں مداخلت بھی۔ ان سچے ایمان والوں کے مابین کوئی تصفیہ کبھی نہیں ہوگا۔

میرا مؤقف یہ ہے کہ ہر اسقاطِ حمل ایک ناگہانی المیہ ہوتا ہے، جو بہت سی انسانی غلطیوں کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ میرے سامنے آنے والا یہ ایک انتہائی مشکل اخلاقی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ صدر کی حیثیت سے میں نے تسلیم کیا کہ رو بمقابلہ ویڈ سپریم کورٹ رولنگ پر عمل کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہر ممکن طریقے سے اسقاطِ حمل کی تعداد کم کروانے کی کوششیں کیں۔ اس کے لیے میں نے اسقاطِ حمل کے حوالے سے قانونی پابندیاں عائد کیں، غیر مطلوبہ حمل ٹھہرنے سے تحفظ کا اہتمام کیا،

Marfat.com

حاملہ عورتوں کو بچے کو جنم دینے کا حوصلہ دلایا اور بچوں کو گود لینے کا رواج بڑھایا۔

میری پوری سیاسی مہم اور میری صدارت کے دوران ذرائع ابلاغ نے مجھ پر اسقاطِ حمل کے حوالے سے سوالات کی بمباری جاری رکھی۔ میرا سب سے زیادہ یاد رکھا جانے والا اور سب سے زیادہ دہرایا جانے والا تبصرہ جولائی 1977ء میں ایک صدارتی پریس کانفرنس کے دوران سامنے آیا تھا، کہ جب میں نے غریب ماؤں پر اسقاطِ حمل کے لیے وفاقی فنڈز خرچ نہ کرنے کا دفاع کیا تھا۔ حالانکہ امیر عورتین تو اپنے حمل گروانے کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ میں نے اس حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب محتاط انداز میں سوچے بغیر یوں دیا تھا، ''زندگی اکثر نا منصفانہ ہوتی ہے۔''

میں اس وقت بھی اسے ممکن سمجھتا تھا اور اب اس کا امکان مجھے دکھائی دیتا ہے کہ سپریم کورٹ کی طرف سے حاملہ عورت کے لیے تجویز کردہ بنیادی حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے اسقاطِ حمل کی ضروریات یا خواہش میں ٹھوس کمی لائی جا سکتی ہے۔ میں بچوں کو اپنانے کے پُرکشش پروگراموں کا حامی تھا، اس امید کے ساتھ کہ جو بچہ غیر مطلوب ہو یا بغیر منصوبے کے وجود میں آ گیا ہو، اس کی پیدائش کی حوصلہ افزائی کی جائے، ساتھ ہی اس بچے کو اپنانے کے لیے کسی شادی شدہ عورت مرد کو تیار کیا جائے۔ میری حکومت میں نئی ماؤں اور ان کے نومولود بچوں کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی۔

مختصر یہ کہ میں نے غیر مطلوب حمل سے لوگوں کے محفوظ رہنے اور متوقع ماؤں کو اپنے بچوں کو جنم دینے کی حوصلہ افزائی کی ہر ممکن کوشش کی۔ بغیر کسی معذرت کے میں نے اس مسئلے کو اس سادہ نکتۂ نگاہ کے تحت سلجھانے کی کوشش کی کہ ''ماں کی کوکھ میں موجود ہر بچے کو مطلوب بچہ ہونا چاہیے۔'' ضروری ہے کہ 13 سے 19 سال کے بچوں (Teenagers) کے لیے بے تکلفانہ اور مؤثر سیکس ایجوکیشن کا اہتمام کیا جائے۔ اس دوران یہ اَمر ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بنیادی زور پرہیز پر ہو، اس کے علاوہ محفوظ اور مصدقہ برتھ کنٹرول طریقوں کو اپنانے کی تعلیم دی جائے۔

بیشتر زندگی کے حامی ایکٹوسٹوں کو پیدا ہو جانے والے بچے کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور وہ فلاحی پروگراموں میں بہت کم حصہ لیتے ہیں جنہیں وہ ''سوشلسٹک'' پروگرام

Marfat.com

کہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب کوئی ماں اسقاطِ حمل نہ کروانے کا فیصلہ کرتی ہے تو عموماً اسے اور اس کے خاندان کو بہت سی ضرورتوں کا سامنا ہوتا ہے: ماں کے لیے مسلسل تعلیم، یا اس کی ملازمت سے زچگی کی چھٹی، خصوصی حفظانِ صحت، پیدائش کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انشورنس، رہائش کا الاؤنس، مناسب اجرت، ملازمہ ماں اور اس کے بچے کو اچھی زندگی گذارنے کے قابل ہونے کے لیے ٹیکس کی چھوٹ۔ اسقاطِ حمل کروانے والی دو تہائی عورتوں کا کہنا ہے کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بچے کے اخراجات اٹھانے سے قاصر ہیں۔

امریکہ میں اسقاطِ حمل کے اعداد و شمار حاصل کرنے کے ذرائع دو ہیں: دی ایلن گٹما خر انسٹی ٹیوٹ (The Alan Guttmacher Institute) اور سینٹرز فار ڈیزیز کنٹرول (Centers for Disease Control)، اور ان کی تازہ ترین رپورٹ 2002ء ظاہر کرتی ہے کہ غیر ارادتاً حاملہ ہو جانے والی عورتوں میں سے 47 فی صد نے اسقاطِ حمل کروالیا۔ ایسی ہر دس میں چھ عورتیں پہلے سے ماں تھیں، 40 فی صد سفید فام تھیں، 32 فی صد سیاہ فام تھیں اور 20 فی صد ہسپانوی۔ ان میں سے نصف عورتوں کی عمریں بیس سے تیس سال کے درمیان تھیں اور 15 فی صد کے قریب کی عمر 13 سے 17 سال کے درمیان تھی۔ اسقاطِ حمل کے ضمن میں نسل، عمر، ازدواجی حیثیت یا پہلے سے بچوں کی موجودگی کسی حوالے سے کوئی واضح پیٹرن نہیں ہے۔ سب سے زیادہ عمومی اور غالب عامل غربت ہے۔ دس میں سے چھ اسقاطِ حمل ایسی عورتیں کرواتی ہیں جن کے تین افراد کے گھرانے کی سالانہ آمدنی 28000 ڈالر ہے۔

اقتصادی خوش حالی اور بھرپور فلاحی پروگراموں کی بدولت 1990ء کی دہائی میں امریکہ میں بچہ جننے کی عمر والی ایک ہزار عورتوں میں سے صرف 16 نے اسقاطِ حمل کرایا، جو کہ 24 سال کی سب سے کم شرح تھی۔ یہ بات طویل عرصے سے معروف ہے کہ ان ملکوں میں اسقاطِ حمل کی شرح بہت کم ہے جہاں متوقع ماؤں کو مانعِ حمل ادویات واشیاء تک رسائی حاصل ہے، اس اَمر کی ضمانت ہے کہ ان کی اور ان کے نومولود بچوں کی صحت کے تحفظ کا اچھا انتظام ہے، یا کم از کم ان کی آمدنی ان کی بنیادی ضرورتوں کو

Marfat.com

پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔

سب سے نمایاں مثالیں بیلجیئم اور نیدرلینڈز کی ہیں جہاں بچہ جننے کی عمر والی ہزار عورتوں میں سے صرف 7 عورتیں اسقاطِ حمل کراتی ہیں۔ پیرو، برازیل، چلی اور کولمبیا جیسے ملکوں میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے، اسقاطِ حمل غیر قانونی ہے اور سوشل سروسز بہت کم مہیا کی جاتی ہیں۔ ان ملکوں میں اسقاطِ حمل کی شرح ایک ہزار عورتوں میں پچاس ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق یہ غیر محفوظ اسقاطِ حمل کی سب سے اونچی شرح ہے۔

ایک اچھی لیکن الٹ نتائج پیدا کرنے والی سوچ یہ ہے کہ بچوں کو حمل سے محفوظ رہنے کے طریقے نہ سکھنے دیئے جائیں۔ حالانکہ دوسرے ملکوں مین بچوں کو ایسی تعلیم مکمل طور پر اور باقاعدگی سے دی جاتی ہے۔ اب اگرچہ وفاقی حکومت سیکس ایجوکیشن پر غیر معمولی مقدار میں رقوم خرچ کر رہی ہے لیکن اس سیکس ایجوکیشن میں ہر قسم کی مانعِ حمل ادویات واشیاء کا تذکرہ ممنوع ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ امریکی بچے 18 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی جنسی عمل کر گزرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں انکشاف کیا گیا ہے کہ کینیڈا اور یورپ کے بچے بھی جنسی اعتبار سے امریکی بچوں ہی کی طرح فعال ہیں تاہم مناسب سیکس ایجوکیشن سے محروم امریکی لڑکیاں فرانسیسی لڑکیوں کی نسبت پانچ گنا زیادہ تعداد میں ایک بچے کی ماں ہوتی ہیں۔ سات گنا زیادہ امریکی لڑکیاں ایک مرتبہ اسقاطِ حمل کروا چکی ہوتی ہیں اور نیدرلینڈز کی لڑکیوں کے مقابلے میں 77 گنا زیادہ امریکی لڑکیاں سوزاک کا شکار ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی کے ٹین ایجروں کے مقابلے میں 5 گنا زیادہ امریکی ٹین ایجر ایچ آئی وی/ایڈز کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ اَمر واضح ہے کہ ہمارے ٹین ایجر اتنے پختہ ضرور ہو چکے ہیں کہ انہیں جنس کے حوالے سے حقائق سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ ان کا حق ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے قابل ہوں .... ترجیحاً پرہیز کے ذریعے، تاہم اگر وہ ارادتاً منتخب کریں تو مانعِ حمل ادویات واشیاء کے دانش مندانہ استعمال کے ذریعے۔ ہماری حکومت کی بعض بین الاقوامی پالیسیاں بھی اتنی ہی الٹ

Marfat.com

نتائج پیدا کرنے والی ہیں۔ مارچ 2002ء میں روزالن اور میں بل گیٹس سینیئر اور اس کی بیوی میمی (Mimi) کے ساتھ افریقہ کے دورے پر گئے۔ ہمارے دورے کا مقصد بل اینڈ مِلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن (Bill and Melinda Gates Foundation) کی مالی امداد سے اس علاقے میں ایچ آئی وی ایڈز کے ہولناک اثرات کو کم کرنا تھا۔ ہم مختلف طبقوں کے شہریوں سے ملے۔ ان میں طوائفوں سے لے کر قومی لیڈر تک شامل تھے۔ ہمیں پتا چلا کہ ایچ آئی وی/ایڈز پر قابو پانے میں یوگنڈا اور سینیگال میں اہم کامیابیاں ہوئی ہیں تاہم بوٹسوانا اور جمہوریۂ وسطی افریقہ میں ہولناک ناکامیاں ہوئیں جبکہ جنوبی افریقہ، کینیا، ایتھوپیا اور نائیجیریا میں بھی 6 فی صد آبادی ایچ آئی وی پازیٹو (HIV-Positive) ہے۔

سب سے مؤثر اقدام واضح سیکس ایجوکیشن اور انفیکشن سے محفوظ رہنے کے لیے کنڈوم کا استعمال تھا۔ اس کے علاوہ حاملہ ماؤں کو بھی وائرس سے محفوظ رکھنے والی ادویات دی جاتی تھیں تاکہ نومولود بچوں میں ایچ آئی وی انفیکشن کی شرح کم ہو جائے۔ اگرچہ اس پر خرچ بہت آتا تھا تاہم پہلے سے متاثرہ بالغ افراد کی تکلیف کم کرنے اور ان کی زندگی کو طویل کرنے کے لیے انہیں علاج مہیا کرنے کی ضرورت تھی۔

امریکی کانگرس کے بہت سے ارا کین ایسے ہیں جو غیر ملکی امداد کا دوسرے ملکوں میں فیملی پلاننگ سروسز کے لیے استعمال رکوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب وائٹ ہاؤس کی مدد سے انتہائی فلاحی پروگراموں میں ان کی پسند کی ترامیم کر دی گئی ہیں۔ اگر ترقیاتی امداد کا مقصد مصائب اور تکلیفوں کو کم کرنا، بالغوں کی زندگیوں کو بہتر بنانا اور ننھے بچوں کی موت کی شرح کو کم کرنا ہے تو اس پالیسی کے اثرات و نتائج الٹ ہوں گے۔

یہ قانون سازجی سطح پر تیسری دنیا کے ملکوں کے حوالے سے بالکل جنونی ہوتے ہیں، جبکہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان پر زندگی کے حامیوں کا سیاسی دباؤ بہت زیادہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بچوں کی زندگیاں بچانے سے صرف اور صرف آبادی میں اضافہ ہوگا اور مستقبل میں مشکلات بڑھ جائیں گی۔ حیرانی کی بات ہے کہ

Marfat.com

اعداد و شمار اس کے بالکل اُلٹ حقیقت ظاہر کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ اگر شیر خوار بچوں کی بقا کا بہتر موقع ہو تو ان کے ماں باپ کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ آبادی میں اضافے اور کمی کی شرح اور ننھے بچوں کی موت کی شرح میں اضافے اور کمی میں باہمی تعلق ہے.......... دونوں میں اضافہ ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور کمی بھی ساتھ ساتھ۔

زندگی کا تقدس ایک بنیادی اخلاقی معاملہ ہے اور اس کے ساتھ مذہبی اور سیاسی وابستگی ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک متوازن اقدام ضرور کیا جانا چاہیے۔ ایک متنازعہ معاملہ سٹیم سیل ریسرچ (Stem Cell Research) ہے۔ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ایک بار آور انسانی بیضہ ایسے خلیات مہیا کر سکتا ہے جن کے بہت سے استعمال ممکن ہیں۔ ان سے ذیابیطس، الزائیمر، پارکنسن اور ریڑھ کی ہڈی کی خرابیوں سے بچا جا سکتا ہے یا ان کا علاج ممکن ہے۔ (بار آور انسانی بیضہ انگریزی میں کسی جملے کے آخر میں لگائے جانے والے فل سٹاپ جتنا ہوتا ہے)۔

2004ء میں کیلیفورنیا کے ووٹروں نے نینسی ریگن سمیت ممتاز ری پبلکنوں اور گورنر آرنلڈ شوارزینگر کی بھرپور تائید و حمایت سے ایک ریفرنڈم کے ذریعے سٹیم سیل ریسرچ کے ایک بہت بڑے پروگرام کی منظوری دی۔ بعد میں ہونے والے رائے عامہ کے ایک سروے سے پتا چلا کہ کم از کم تین تہائی امریکی ایسی کوششوں کے حامی ہیں۔ اس بھرپور عوامی حمایت کے باوجود بعض زندگی کے حق کے دعویدار ایکٹوسٹوں اور صدر بش نے سٹیمسیل کے حوالے سے نئی تحقیق کی زوردار مخالفت کی۔ صدر نے کہا کہ کچھ پرانی لائنز کو استناد دیا جا چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سوال یہ ہے، ''ہم مہلک بیماریوں کا علاج ڈھونڈنے کے لیے ٹیکس دہندگان کی رقوم استعمال کریں یا نہ کریں۔'' انسانی سٹیم سیل لائنز حکومتی فنڈ سے کی جانے والی تحقیق کے لیے دستیاب ہیں، تاہم انہیں چوہوں کے خلیوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ سائنس دان اس شرط کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وسیع تحقیق کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے۔

امریکی ہاؤس اور سینیٹ کی دونوں پارٹیوں کے اراکین کی اکثریت محدود قانون سازی کی حامی ہے، جس کے تحت تحقیق کے لیے نئے خلیات بنانے کی اجازت

Marfat.com

تو نہیں ہوگی البتہ بارآوری کلینکوں میں منجمد کیے گئے اضافی ایمبر یوز کو استعمال کیا جائے گا، بشرطیکہ والدین اپنے آپ کو اس محدود مقصد کے لیے پیش کرنے کو تیار ہوں۔ چار لاکھ منجمد کیے گئے نیز غیر استعمال شدہ ایمبر یوز میں سے صرف دو فیصد ان خاندانوں کو دیئے گئے جو اولاد کے خواہش مند تھے جبکہ باقی کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ مجوزہ قانون ان میں سے چند کو استعمال کرنے کی اجازت دے گا، اور ٹیکس دہندگان کی رقم کو کلوننگ یا دوسرے ذرائع سے نئے نئے ایمبر یوز تخلیق کرنے سے روکے گا۔ ان پابندیوں کے باوجود صدر نے ایسی کسی قانون سازی کو ویٹو کرنے کا عہد کیا ہے۔

مئی 2005ء میں ایک حیران کن اعلامیئے میں انکشاف کیا گیا کہ جنوبی کوریا کے سائنس دان ایک ایسا انقلابی سائنسی پروسیجر تیار کر چکے ہیں جو عظیم طبی فوائد کا حامل ہے۔ انہوں نے ذیابیطس، ریڑھ کی ہڈی کی خرابیوں اور دوسرے مہلک امراض کے مریضوں کے عطیہ کردہ خلیات کو استعمال کر کے نئی سٹیم سیل لائنز بنائی ہیں جو کہ بیماروں کی سٹیم سیل لائنز سے موروثی طور پر مشابہ ہو سکتی ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ پیدائش سے پہلے زندگی کا مسئلہ مذہبی، سیاسی اور سائنسی حلقوں میں زوردار بحثوں کا موضوع بنا رہے گا۔ مذہب انسانی زندگی کو بہت زیادہ تقدس دیتا ہے تاہم متضاد بات یہ ہے کہ خوردبینی سٹیم سیلز کے جوشیلے محافظ سزائے موت کے اتنے ہی جوشیلے حامی ہیں۔

سزائے موت

جب میں جارجیا کا گورنر تھا تو مجھ میں اور دوسری ریاستوں کے گورنروں میں یہ مقابلہ جاری تھا کہ کون اپنے قید خانوں کی آبادی میں سب سے زیادہ کمی کر سکتا ہے۔ ہم نے ادارہ جاتی اصلاح کے لیے بہت کوششیں کیں۔ ہم نے قیدیوں کو بنیادی تعلیم دینے، ان کی کریئر ٹریننگ (Career Training) اور نفسیاتی بحالی کے لیے ماہرین کی مدد حاصل کی۔ اس کے بعد بعضوں کو وقت سے پہلے رہا کر دیا گیا اور بعضوں کو کام کرنے کے لیے رہا کیا گیا۔ میں نے خود لائنز، روٹری، سِیوٹن اور کیوانیز سروس

Marfat.com

کلبوں میں سے رضا کار بھرتی کیے۔ انہیں پروبیشن افسر کی حیثیت سے کام کرنے کی تربیت دی گئی جبکہ ان کی ذمہ داری صرف ایک تھی، اور وہ یہ کہ صرف ایک متوقع پیرولی (Parolee) کو اپنے ذمے لینا، اس کے گھرانے سے رابطہ رکھنا اور اس کے لیے ملازمت ڈھونڈنا، جو وہ پیرول ملنے کے بعد حاصل کرسکتا تھا۔ 1970ء کی دہائی میں ایک ہزار امریکیوں میں سے صرف ایک جیل میں تھا۔

وہ پالیسی اب مکمل طور پر نہ صرف ختم کر دی گئی ہے بلکہ الٹ دی گئی۔ اب ہماری پوری قوم کا زور سزا پر ہے، بحالی پر نہیں۔ یہ بنیاد پرستی کی خصوصیت ہے: ''میں حق ہوں اور اہم ہوں۔ تم باطل ہو اور مستوجب سزا ہو۔'' اب ایک ہزار امریکیوں میں سے سات جیل میں ہیں.......... ان میں سے بیشتر غیر متشددانہ جرائم کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ یہ دنیا میں قید کی سب سے زیادہ شرح ہے۔ سوویت روس کی ایک ہزار میں سے چھ افراد قید میں ہونے کی شرح سے بھی زیادہ۔ بہت سی امریکی ریاستوں میں تعمیراتی صنعت کی سب سے بڑی مصروفیت جیلوں کی نئی کھوٹھڑیاں بنانا ہے جبکہ جیل گارڈز کی ملازمت کے مواقع میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ میرے بعد جارجیا کے گورنر رہنے والے ایک سیاست دان نے میری بیوی کے سامنے فخریہ کہا کہ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے تقریباً 45 مربع میل رقبے پر جیل کی نئی کوٹھڑیاں تعمیر کروائی تھیں۔ ہماری ریاست کا ''دو ہڑتالیں اور تم فارغ'' والا قانون اس صنعت کے فروغ میں مدد دے گا۔

لوگوں کو قید کرنے کے علاوہ امریکہ کو ایک اور خبط ہے، اس حوالے سے پوری دنیا میں اس کا کوئی مقابل نہیں، اور وہ ہے سزائے موت کا خبط۔ اس حوالے سے ہماری رفیق حکومتیں صرف وہی ہیں جو کہ انسانی حقوق کا احترام نہیں کرتیں۔ دنیا بھر میں دی جانے والی کُل سزائے موت میں سے نوے فیصد صرف چار ملکوں میں دی جاتی ہے: چین، ایران، سعودی عرب اور امریکہ۔ درحقیقت صرف ہمارے ملک اور صومالیہ نے ہی (جہاں کوئی منظم حکومت نہیں ہے) بچوں کے حقوق کے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس معاہدے میں مجرم بچوں کو سزائے موت دینے پر

Marfat.com

پابندی لگائی گئی ہے۔ 1990ء سے امریکہ کے سوا صرف سات ملکوں میں کم عمر مجرم بچوں کو سزائے موت دی گئی۔ ان میں ایران، پاکستان، سعودی عرب، یمن، نائیجریا، چین اور ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگو شامل تھے۔ اب ان ملکوں میں بھی بچوں کو سزائے موت نہیں دی جاتی۔ آخر مارچ 2005ء میں امریکی سپریم کورٹ نے چار کے مقابلے میں پانچ ووٹوں سے بچوں کو سزائے موت دینے پر پابندی لگا دی۔ قدامت پرست عیسائیوں نے اس فیصلے پر سخت تنقید کی۔ یہ کہنا کسی حد تک غیر منطقی لگتا ہے، ''تم نے خداوند کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے پس میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' بدقسمتی سے امریکیوں کی اکثریت اب بھی اس فلسفے کو مانتی ہے۔

1972ء میں سپریم کورٹ نے رولنگ دی کہ سزائے موت ''ظالمانہ اور غیر معمولی'' لہٰذا غیر آئینی ہے۔ تاہم یکم جولائی 1976ء کو عدالت نے دو کے مقابلے میں سات ووٹوں سے اس رولنگ کو واپس لے لیا، البتہ کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور سزائے موت بحال کر دی گئی۔ میں اسے ہمیشہ اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں کہ گورنر اور صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے دوران میرے حلقۂ انتخاب میں کسی کو سزائے موت نہیں دی گئی۔

سزائے موت کے حامی اس کی کلیدی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے ڈر سے قتل اور دوسرے بڑے جرم کم ہوتے ہیں۔ درحقیقت شواہد بتاتے ہیں کہ صورتِ حال اس کے الٹ ہے۔ امریکہ میں قتل کی شرح یورپ کے کسی بھی ملک سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ جبکہ کسی یورپی ملک میں سزائے موت رائج نہیں ہے۔ جنوبی ریاستوں میں سزائے موت دیئے جانے کی شرح 80 فی صد سے زیادہ ہے لیکن وہاں قتل کی شرح کسی دوسرے علاقے سے بہت زیادہ ہے۔ ٹیکساس میں اب تک سب سے زیادہ سزائے موت دی گئی ہے لیکن یہاں قتل کی شرح وسکانسن کے مقابلے میں دوگنا زیادہ ہے۔ وسکانسن پہلی ریاست ہے جہاں سزائے موت ختم کر دی گئی ہے۔ یہ جغرافیے یا نسلیت کا سوال نہیں ہے جیسا کہ ایسی ہی اور متصل ریاستوں سے عیاں ہے: سزائے موت دینے والی ریاستوں ساؤتھ ڈکوٹا، کنکٹی کٹ اور ورجینا میں سزائے موت نہ دینے

Marfat.com

والی متصل ریاستوں نارتھ ڈکوٹا، میساچوسٹس، اور ویسٹ ورجینا کی نسبت بڑے جرائم کی شرح زیادہ ہے۔ مزید برآں اس اَمر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سزائے موت زیادہ دینے سے بُرے جرائم کم ہو جاتے ہیں یا یہ کہ سزائے موت ختم کر دینے سے جرائم بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ راسخ العقیدہ عیسائی سزائے موت کے پُر جوش حامیوں میں شامل ہیں۔ وہ یسوع مسیح کی ہدایت کے برعکس عمل کر رہے ہیں۔ وہ اپنی تائید میں عبرانی صحیفوں کی غلط تعبیر کر رہے ہیں: ''آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔'' وہ اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے تو ایک حد قائم کی تھی، انہوں نے تو مجرم کی دونوں آنکھیں نکالنے یا سارے دانت توڑنے کی بجائے بدلے میں ایک آنکھ نکالنے اور ایک دانت توڑنے کا کہا تھا۔ اس کے علاوہ یسوع مسیح نے وضاحت کی تھی کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ اور طلاق کے حوالے سے احکام اپنے سامعین کے ''دلوں کی سختی'' کی وجہ سے دیئے تھے۔

بائبل میں مجوزہ سزائے موت کی بجائے رحم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جیسا کہ خداوند نے پہلے معلوم قاتل قابیل کو زندہ رہنے دیا اور اسے نقصان پہنچانے والے سے سات گنا زیادہ بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ ایزکائیل 33 میں ایک اور دلچسپ عبارت ملتی ہے، جس کے مطابق خداوند کہتا ہے: ''مجھے بُرے انسان کی موت سے خوشی نہیں ہوتی، میں تو اس کے برائی سے باز آ جانے اور زندہ رہنے سے خوش ہوتا ہوں۔''

یہ بات منطقی لگتی ہے کہ سارے عیسائی یسوع مسیح کی مثال پر عمل کریں لیکن بیشتر پروٹیسٹنٹوں اور کیتھولکوں میں ایک ناقابلِ فہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیتھولک چرچ سزائے موت کے خلاف مضبوط اقدام کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خودمختار حکومتیں کسی مجرم کو سزا دینے کے لیے اس کی جان لینے کا قانونی حق رکھتی ہیں لیکن صرف اس صورت میں کہ سزا کا کوئی اور متبادل نہ ہو۔ پوپ جان پال دوم نے لکھا تھا: ''سزا کی نوعیت اور شدت کا تعین نہایت احتیاط سے کیا جانا چاہیے اور مطلق ضرورت نہ ہو تو مجرم کو سزائے موت نہ دی جائے۔ مطلق ضرورت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی دوسری صورت میں

Marfat.com

معاشرے کو محفوظ رکھنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ تاہم تعزیزی نظام کی بہتری کے نتیجے میں ایسے معاملات بہت کم سامنے آئے ہیں، گو بالکل ختم نہیں ہوئے۔"

1999ء میں سینٹ لوئیس میں پوپ نے سزائے موت کو "ظالمانہ اور غیر ضروری" قرار دیا۔ اس سال گڈ فرائیڈے کے موقعہ پر امریکہ کے کیتھولک بشپ نے یہ اپیل جاری کی:

> "سزائے موت پر بڑھتے ہوئے اعتماد نے ہم سب کو حقیر بنا دیا ہے۔ یہ روش انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے عدم احترام کی علامت ہے۔ ہم مجرموں کو سزائے موت دے کر جرائم پر قابو نہیں پا سکتے، نہ ہی ہم قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار کر مقتولوں کو زندگی واپس دے سکتے ہیں۔ سزائے موت اس المناک خام خیالی کی مظہر ہے کہ ہم زندگی لے کر زندگی کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ ہمیں تعلیم کے ذریعے، دلائل کے ذریعے اور عبادت کے ذریعے اور یسوع مسیح کی حیات پر گہرا غور کر کے سزائے موت کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنی چاہیے۔ موت کے کلچر کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے اور زندگی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔"

سزائے موت کے خلاف سب سے مضبوط دلیل اس کا غیر مساویانہ اطلاق ہے۔ سزائے موت غریبوں کو، پاگلوں کو، اور اقلیتی لوگوں کو دی جاتی ہے جبکہ سفید فام مجرموں کو اس سے بچا لیا جاتا ہے۔ یہ اَمر حیران کن نہیں ہے کہ 1976ء میں سزائے موت کی بحالی کے بعد سے سزائے موت پانے والوں، حد تو یہ ہے کہ وفاقی عدالتوں سے بھی سزائے موت پانے والوں میں سے 76 فی صد کا تعلق اقلیتی گروپوں سے تھا۔ 1999ء میں 127 قتل کرنے والے 99 قاتلوں کو سزائے موت دی گئی۔ 127 میں سے 104 مقتول سفید فام تھے! یہ تقریباً ناقابلِ یقین ہے کہ کوئی امیر سفید فام شخص مہنگے وکیل کے ذریعے مقدمہ لڑنے کے بعد سزائے موت سے بچ جائے، خصوصاً اس صورت میں کہ جب مقتول سیاہ فام یا ہسپانوی ہو۔

حال ہی میں ڈی این اے ٹیسٹ کی دریافت کے بعد پتا چلا ہے کہ سزائے

Marfat.com

موت کے منتظر بہت سے لوگ حقیقت میں مجرم نہیں ہیں۔ جب الی نائے کے گورنر جارج ریان کو پتا چلا کہ سزائے موت پانے والے تیرہ لوگ بے گناہ ہیں تو انہوں نے سزا پر عمل درآمد وقتی طور پر روک لیا اور ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد پانچ اشخاص کو رہائی دے دی گئی۔ 1973ء سے اب تک سزائے موت کے منتظر 120 افراد کو رہائی دی جا چکی ہے۔

میری گذشتہ کتاب Sharing Good Times کا انتساب میری پرنس (Mary Prince) کے نام تھا۔ میری ایک بہت اچھی سیاہ فام عورت ہے جو اپنی ٹین ایج میں ایک چھوٹے سے قصبے کی سیر کے دوران قتل کے جرم میں پکڑی گئی تھی۔ ایک اجنبی وکیل نے اس کا مقدمہ لڑا، جس سے وہ مقدمے کے روز پہلی بار ملی تھی۔ وکیل نے اسے اعترافِ جرم کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ اسے ہلکی سزا دلوائے گا۔ میری کو عمر قید ہو گئی۔ اچھے رویے کی وجہ سے اسے ٹرسٹی کا رتبہ دے کر گورنر کے مینشن میں خادمہ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہ اتنی اچھی خدمت گار تھی کہ میں نے خود کو اس کا پیرول افسر مقرر کروالیا۔ یوں وہ چار سال وائٹ ہاؤس میں ہمارے ساتھ رہی۔ جب اصل ٹرائل جج نے اس مقدمے کا دوبارہ جائزہ لیا تو پتا چلا کہ میری تو مکمل طور پر بے گناہ ہے۔ تب اسے معافی دے دی گئی۔ وہ خوش قسمت تھی ورنہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ سزائے موت دے دی گئی ہوتی۔ اگر مقتول سفید فام ہوتا تو ہم کبھی میری پرنس سے واقف نہ ہوتے!

شاید اس کی تقدیر لینا بیکر جیسی ہوتی۔ لینا بیکر ایک سیاہ فام عورت تھی۔ ایک سفید فام شخص نے اسے اپنی غلامی میں رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا۔ 1945ء کے ایک دن کا ذکر ہے کہ تمام سفید فاموں پر مشتمل جیوری نے اس کو سزائے موت دے دی۔ اس نے جیوری کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ جب اس کے مالک نے اسے لوہے کی سلاخ لہراتے ہوئے مارنے کی دھمکی دی تو اس نے اسے گولی مار دی۔ اس مقدمے کا پوری طرح دوبارہ جائزہ لینے کے بعد اسے اگست 2005ء میں مکمل معافی دی گئی .... بجلی کی کرسی پر مرنے کے 60 سال بعد۔

Marfat.com

سزائے موت کے اطلاق کے حوالے سے عظیم جمہوری قوموں میں امریکی تنہا کھڑے ہیں۔ یہ ایک اور اخلاقی فیصلہ ہے جس کا سامنا کرنے پر امریکیوں کو مجبور کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ماضی میں اکثریت سزائے موت کی حامی تھی، تاہم اب رائے عامہ تبدیل ہو رہی ہے۔ ایک حالیہ سروے سے پتا چلتا ہے کہ جب امریکیوں کو معلوم ہوا کہ ڈین این اے ٹیسٹ اور دوسری شہادتوں کی وجہ سے سزائے موت کے منتظر بے شمار بے گناہ رہا ہوئے ہیں تو وہ سزائے موت کی معطلی کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔

عیسائیوں کے لیے ایک اور سوال: اگر یسوع مسیح کو ایسا انتخاب درپیش ہوتا تو وہ کیا کرتے؟

Marfat.com

نواں باب

کیا عورتوں کو لازماً محکوم ہونا چاہیے؟

''تمام انسانوں کو مساوی تخلیق کیا گیا ہے'' کے اعلان کے 94 سال بعد 1870ء میں امریکی آئین کی پندرہویں ترمیم کے ذریعے سیاہ فاموں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ یہ اس کے بھی 50 سال بعد کا واقعہ ہے کہ آخر عورتوں نے یہی حق جیت لیا، اور اس زمانے سے عورتوں کے حالات میں آہستہ آہستہ بہتری آرہی ہے.......... کم از کم سیکولر دنیا میں۔ فرینکلن ڈی روزویلٹ پہلے صدر تھے جنہوں نے ایک عورت کو اپنی کابینہ میں پہلی مرتبہ شامل کیا تھا۔ میں نے اور دوسرے صدور نے اپنی اپنی کابینہ اور وائٹ ہاؤس کے سٹاف میں عورتوں کو اہم کردار دیئے۔ میں نے اپنے تمام پیشروؤں سے مجموعی طور پر زیادہ تعداد میں عورتوں کو وفاقی جج مقرر کیا۔ اب بہت ساری عورتیں گورنر ہیں، وہ ہاؤس اور سینیٹ کی رکن ہیں، اور بڑی کارپوریشنوں کی چیف ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، اسرائیل، برطانیہ، فلپائن، اور نکاراگوا میں عورتیں صدر یا وزیرِ اعظم منتخب ہو چکی ہیں۔ ان ملکوں کی اکثریتی آبادی ہندو، مسلمان، یہودی اور عیسائی ہے اور ان میں دنیا کی تین عظیم ترین جمہورتیوں میں سے دو شامل ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ یسوع مسیح عورتوں کے سب سے بڑے آزادی دہندہ تھے، عیسائی عقیدے کے کچھ مرد لیڈر صنفی امتیاز برت رہے ہیں، عورتوں کی تحقیر کر رہے ہیں اور انہوں نے خداوند کی خدمت کرنے کے عورتوں کے مساوی حق سے ان کو محروم کر رکھا ہے۔ بعض اسلامی ملکوں میں بھی بیویوں کو خاوندوں کے تابع رکھا جاتا ہے اور عورت کو مرد سے کمتر تصور کیا جاتا ہے۔ اس مستقل مذہبی تسلط کی وجہ سے عورتیں دنیا بھر کی سیکولر کمیونٹی میں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔

Marfat.com

بائبل کے بیشتر سکالرز تسلیم کرتے ہیں کہ جب مقدس صحیفوں کو لکھا گیا، تب زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کی برتری تھی۔ جب یسوع مسیح نے تبلیغ شروع کی تو پوری رومن سلطنت اور ارضِ مقدس میں عورتوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھا جاتا تھا جیسا کہ ہم نے کچھ ہی عرصے پہلے طالبان کے دورِ حکومت میں افغانستان میں دیکھا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ شادی اور طلاق جسے معاملوں میں بھی عورتوں کو بے جان اشیاء تصور کیا جاتا تھا، جو اپنے باپوں یا خاوندوں کے فیصلوں سے سرِ مُو اختلاف نہیں کر سکتی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ممتاز اور معزز آدمیوں کی بیواؤں کو بھی چند ہی قانونی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ مرد بہت سی عورتیں اپنی ملکیت میں رکھ سکتے تھے لیکن زنا کی مرتکب عورت کو پتھر مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

بائبل کی کتابِ پیدائش میں دو جگہ انسان کی تخلیق کا ذکر ہے، جو کسی حد تک متضاد ہے۔ کتابِ پیدائش 1:26-27 میں ہے کہ جب چھٹا دن ہوا تو ''خداوند نے کہا، اب ہم انسان کو اپنی شبیہ پر، اپنے مثل بنائیں گے،......... پس خداوند نے انسان کو اپنی شبیہہ پر بنایا، مرد اور عورت کو خداوند نے تخلیق کیا۔'' پھر کتابِ پیدائش کے دوسرے باب میں خداوند نے مرد کو پہلے تخلیق کیا اور بعد میں فیصلہ کیا کہ اسے ساتھی کی ضرورت ہے۔ ''پس خداوند نے مرد پر گہری نیند طاری کر دی اور وہ سو گیا، پھر اس نے اس کی ایک پسلی (نکال) لی اور (خالی) جگہ کو گوشت سے بھر دیا۔ خداوند نے مرد کی نکالی ہوئی پسلی کو عورت بنا دیا اور مرد کے پاس لایا......... اسی لیے مرد اپنے باپ اور اپنی ماں کو چھوڑ کر اپنی بیوی سے چمٹ جاتا ہے، اور وہ یک قالب بن جاتے ہیں۔''

کتابِ مقدس کی اِن دونوں عبارتوں میں مرد اور عورت کی قدر و قیمت کو باہمی اور مساوی بتایا گیا ہے۔ تاہم بعض عیسائی بنیاد پرستوں نے دوسری عبارت کو اپنے اس عقیدے کی بنیاد بنایا ہوا ہے کہ مرد عورت سے اعلیٰ و برتر ہے کیونکہ اسے پہلے تخلیق کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ''گناہِ اولین'' کی ذمہ داری صرف ایو (EVE) پر عائد ہوگی۔ میرے خیال میں ایسے معاملات پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ بائبل کی 30400 کے لگ بھگ عبارتوں

Marfat.com

میں سے اپنے مطلب کی عبارتیں ڈھونڈ کر ان کو ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔

یسوع مسیح اور عورتوں کے تعلق کے حوالے سے ایک حقیقت غیر متنازعہ ہے، اور وہ یہ کہ آپ ان کے ساتھ مساوی انسانوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہ حقیقت موجود دور کی غالب روش سے ڈرامائی حد تک مختلف ہے۔ اگرچہ بائبل کی چاروں کتابیں مردوں نے لکھی ہیں، تاہم انہوں نے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں لکھا جس میں یسوع مسیح نے صنفی امتیاز کو درست قرار دیا ہو یا عورتوں کو محکوم اور کمتر کہا ہو۔ اولین ماہرِ انساب میتھیو نے تو چار غیر یہودی عورتوں کو یسوع مسیح کے آباؤ اجداد میں شامل کر دیا۔ ثمر، ریہب، رتھ اور بتھشیبا یسوع مسیح کی والدہ کو بلند مرتبہ دیا جانا اور بعض ازاں ان کی عبادت کی جانی، اس امر کی واضح علامت ہے کہ عیسائی الٰہیات میں عورتوں کو خصوصی درجہ دیا گیا ہے۔

یسوع مسیح کی ارضی زندگی میں بہت زیادہ مثالیں ہیں تاہم دو یا تین بہت اہم ہیں۔ عورتوں سے کھلے عام میل جول پر پابندی کے باوجود یسوع مسیح ایک سمارٹن عورت سے بلا جھجک گفتگو کیا کرتے تھا، حالانکہ یہودی اور اس کی کمیونٹی کے شرفاء اس کی نسل اور اس کے بُرے رویے کی وجہ سے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ اس نے یسوع کو مسیحِ موعود (Promised Messiah) کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا اور اس پیغام کو اپنی بستی میں لے گئی تھی .... ایوانجیلیکل شہادت (Witness) کی پہلی مثال۔ یسوع مسیح نے زناکاری کی سزا کے دہرے معیار کو بھی ردّ کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اس عورت کو معاف کر دیا تھا، ''اس کو پہلا پتھر وہ مارے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔''

شاید سب سے اہم مثال عورتوں کا یسوع مسیح کے قافلے میں شامل کیا جانا، اور ان کی مالی اور روحانی امداد کی قبولیت ہے۔ شاید آپ کو سب سے زیادہ اعتماد جس پر تھا، وہ میری (Mary) تھی، لازارس (Lazarus) کی بہن۔ آپ اس سے ملنے اکثر بیتھنی جایا کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھی جو سمجھتے تھے کہ آپ کو مصلوب کر دیا جائے گا اور دوبارہ حیات دی جائے گی۔ میری میگڈالین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بہادری کے ساتھ آپ کے خالی مزار پر جایا کرتی تھی، اور پھر

Marfat.com

نجات دہندہ نے اسے تمام دوسرے حواریوں کو، جو کہ خوف سے خفیہ جگہ چھپے ہوئے تھے، اطلاع دینے کا کہا کہ نجات دہندہ اپنی قبر سے اٹھ چکا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ اب ہر بڑے پیشے اور دوسرے قائدانہ عہدوں پر عورتوں کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے لیکن انہیں قائدانہ عہدوں پر رہ کر یسوع مسیح کی خدمت کرنے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے، حالانکہ یسوع مسیح کی ارضی حیات کے دوران اور اولین چرچوں میں وہ یہ خدمات انجام دے چکی ہیں۔ یہ ایک اور متنازعہ معاملہ ہے جس نے ہمارے مذہب میں تقسیم پیدا کر دی ہے۔ درحقیقت صنف کی بنیاد پر متعصبانہ رویّوں میں شدت بڑھانے کے فیصلے کی وجہ سے میں نے اس فرقے کے ساتھ اپنے تعلقات محدود کر لیے جس سے میں اپنی زندگی کے 75 برسوں سے وابستہ تھا۔

جنوبی بیپٹسٹ کونشن کے لیڈروں کی ''عورتوں کو ان کی حدود میں رکھتے'' کی حالیہ خصوصی کوشش کی اساس یہ مضحکہ خیز دلیل ہے کہ ''مرد کو پہلے تخلیق کیا گیا تھا، جبکہ عورت کو باغِ عدن سے پہلے نکالا گیا تھا''، نیز سینٹ پال کے اولین چرچوں کے نام لکھے گئے خطوط سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے گئے کچھ جملے۔ اگر سینٹ پال کے بعض جملوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پڑھا جائے تو لگتا ہے کہ وہ یسوع مسیح کی مثال کے مطابق عمل نہیں کر رہے اور عورتوں کے خلاف سخت تعصب جھلکتا ہے۔ انہوں نے ہدایت دی تھی کہ عورتوں کے ساتھ دوسرے درجے کے عیسائیوں جیسا سلوک کیا جائے ......انہیں اپنے خاوندوں کی تابع رکھا جائے، سر سے پاؤں تک ڈھانپا جائے اور وہ چرچ میں خاموش بیٹھیں۔

میں کسی صورت یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ پریشان کن جملے غلط ہیں یا خداوند کے بھیجے ہوئے کلام میں تضاد ہے۔ البتہ بعض معاملات میں ضروری یہ ہے کہ اولین چرچ کے حالات کو مدِنظر رکھا جائے اور یونانی اور عبرانی الفاظ کے درست معانی کا مطالعہ کیا جائے۔ ایک واضح مثال یہ ہے: سینٹ پال کہتے ہیں: ''میں عورتوں کے مرد کو پڑھنے یا مرد پر برتری دینے سے منع کرتا ہوں۔'' ''بڑھانے یا برتری ہونے'' کے لیے یونانی لفظ Authentein ہے اور یہ عہد نامۂ جدید میں صرف یہیں استعمال ہوا

Marfat.com

ہے۔ مجھے یونانی نہیں آتی، تاہم سکالرز کا کہنا ہے کہ اس لفظ کے دوسرے معانی میں شامل ہیں ''قتل کرنا''، ''پیدا کرنا''، ''غلبہ پانا'' اور ''لکھنا۔''

بہت سے سکالر کورنتھ کے چرچ کو دی گئیں سینٹ پال کی ہدایات کو بعض گرجوں کے اندرونی خاص مسائل کا بیان، اور اُن ''بہنوں اور بھائیوں'' کے حوالے سے فکر کا ایک اظہار تصور کرتے ہیں، جو کہ الجھے ہوئے اور منتشر تھے۔ ہمارے جدید معاشرے کے عبادت گذاروں کے لیے سینٹ پال کے ان کے اپنے دَور سے متعلق جملوں کو نظرانداز کر دینا سہولت کا باعث ہوگا .... مثلاً جو عورت ننگے سر کے ساتھ عبادت کرتی ہے یا پیش گوئی کرتی ہے، وہ اپنے سر کی بے توقیری کرتی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے اس کا سر گنجا ہو۔ کیونکہ اگر کوئی عورت خود کو نہیں ڈھانپے گی تو اسے اپنے سر کے بال کٹوانے ہوں گے۔'' (اس سے یہ واضح ہو گیا کہ عورت کا عبادت اور پیش گوئی کرنا قابلِ قبول ہے، بشرطیکہ اس کا سر ڈھکا ہوا ہو)۔ سینٹ پال نے عورتوں کو سر کے بالوں کی چوٹیاں گوندھنے اور زیورات اور مہنگے لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے۔ جدید دور کے بیشتر عیسائیوں پر یہ واضح ہے کہ سینٹ پال نے مستقل نوعیت کی پالیسیاں نہیں دی ہیں۔

سینٹ پال نے ٹموتھی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ عورتیں مردوں کو مت پڑھائیں لیکن ہم جانتے ہیں .... اور سینٹ پال بھی جانتے تھے .... کہ خود ٹموتھی کو اس کی ماں اور نانی نے پڑھایا تھا۔ یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ اس زمانے کے ایک عظیم مبلغ اپولوس کو سینٹ پال کی دوست پرسیلا نے پڑھایا تھا اور اسی وجہ سے اس کا احترام کیا جاتا ہے جبکہ اپولوس کو تعلیم دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ یسوع مسیح کے پیغام کو زیادہ مؤثر انداز میں عام کر سکے۔

عورت کے مرتبے کا تعین کرنے میں سینٹ پال اور یسوع مسیح کے مابین پائی جانے والی ظاہری عدم موافقت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں سینٹ پال کی تحریروں سے دو اقتباس دوں گا۔ گیلیشنز کے نام خط میں سینٹ پال لکھتے ہیں، ''تاہم اب جبکہ مذہب آ چکا ہے، ہم کسی نظم وضبط کے پابند نہیں رہے کیونکہ یسوع مسیح پر ایمان لانے کے بعد تم سب خداوند کے بچے ہو .... اب نہ کوئی یہودی ہے نہ یونانی، اب

Marfat.com

نہ کوئی غلام ہے نہ آزاد، اب نہ کوئی مرد ہے نہ عورت، کیونکہ تم سب یسوع مسیح میں ایک ہو۔'' رومنوں کے نام خط میں سینٹ پال نے اولین چرچوں کے 28 غیر معمولی لیڈروں کے نام درج کیے ہیں، جن میں سے کم از کم دس عورتیں ہیں:

''میں سسٹر فیبی کو تمہاری طرف بھیج رہا ہوں، وہ سینچری کے چرچ کی ڈیکن ہیں............ پریسکا اور ایقیلا کو سلام کرو، جنہوں نے میرے ساتھ یسوع مسیح کے لیے کام کیا............ میری کو سلام کرو، جس نے تمہارے درمیان سخت محنت کی ہے۔ اینڈرومیکس اور جونیا کو سلام کرو، یہ میری رشتہ دار ہیں اور میرے ساتھ زنداں میں رہی ہیں، وہ مبلغوں میں ممتاز ہیں، وہ مجھ سے پہلے یسوع مسیح میں تھیں .... فیلولوگس، جولیا، نیریئس اور اس کی بہن، اور اولمپس، اور ان سب سینٹس (Saints) کو سلام کرو، جو ان کے ساتھ ہیں۔''

میرے لیے یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ایسی فیضان یافتہ عورتوں کی، جو کہ کامیاب ڈیکن، مبلغ، منسٹر اور سینٹ ہوں، حوصلہ افزائی کرنے اور انہیں مبارک باد دینے والے سینٹ پال کے جملوں کو جدید دور کے میل شاونسٹ (Male Chauvinists) عورتوں کو تبلیغ کی ذمہ داریاں نہ سونپنے کے انجیلی جواز کے طور پر پیش کریں۔ درحقیقت سینٹ پال نے یسوع مسیح کا یہ سبق کبھی فراموش نہیں کیا تھا: خداوند کی خدمت کے حق کے ضمن میں عورتوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے۔

راسخ العقیدہ عیسائی اپنے مؤقف کی تائید میں انجیل کے حوالے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ تاہم سوال یہ ہے، کیا ہم یسوع مسیح پر ایمان رکھنے والے ایوانجیلیکل یسوع مسیح کی مثال کو رد کرنا چاہتے ہیں اور عورتوں کو خداوند کی بادشاہت کو وسعت دینے کی خداوند کی پکار پر آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں؟

دنیا کے بہت سے ملکوں میں عورتوں پر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور عیسائی بنیاد پرستوں نے عورت کی محکومی کو لازمی قرار دے کر ان کی مشکل میں اضافہ کر دیا ہے۔ میرے لیے خاص طور پر مایوسی کی بات یہ ہے کہ بہت زیادہ مضبوط عیسائی عورتوں نے اپنی محکومی اور محدود کردار کو قبول کر لیا ہے۔

Marfat.com

دسواں باب

بنیاد پرستی حکومت میں

امریکہ کے سینیئر سیاسی لیڈروں میں ہمارے ملک کی اقتدار کی بنیادی آئینی تقسیم کے لیے خطروں کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ واشنگٹن کے بعض زیادہ قدامت پرست حکام نے عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے اپنے اضطراب کو ظاہر کر دیا۔ انہوں نے انتہائی متنازعہ ٹیری سکیاوو مقدمے میں آخری لمحے میں مداخلت کی۔ جبکہ تقریباً بیس ججوں نے اس کی مصنوعی زندگی بڑھانے کے اپنے پندرہ سالہ استرداد کو برقرار رکھا تھا۔ ان ججوں میں سے اکثر قدامت پسند ججوں کو ری پبلکنوں نے ہی متعین کیا تھا۔

سینیٹ میں اکثریتی لیڈر بل فرسٹ نے یہ واضح کرتے ہوئے کہ وہ ایک ہارٹ سرجن کی حیثیت سے بات کر رہے ہیں، اپنے رفقاء سے کہا کہ وہ عدالتی اتفاقِ رائے کی مذمت کرتے ہیں، ''جس کی بنیاد اس ویڈیو کا ریویو ہے، جو میں نے کل رات اپنے دفتر میں ایک گھنٹہ صَرف کر کے دیکھی تھی۔ اس ویڈیو نے مجھ پر مستقل نباتاتی حالت سے بہت مختلف صورتِ حال منکشف کی۔'' یہ تشخیص مسز سکیاوو کے میڈیکل ایگزامنر کے کیے ہوئے معائنے سے مختلف ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ وہ اندھی ہے اور اس کا ذہن نارمل جسامت سے آدھے سے بھی کم ''انتہائی ابنارمل'' ہے۔

ہاؤس میں ری پبلکن کے اکثریتی لیڈر ٹام ڈیلے نے ججوں پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے دھمکی دی کہ ریاستی اور وفاقی عدالتوں پر مقننہ کا کنٹرول قائم کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کانگرس کے ذریعے ججوں کے خلاف تفتیش کے احکامات دیئے اور غصے سے بھرے اعلانات کیے: ''عدالتی آزادی عدالتی برتری کے مساوی نہیں ہے۔'' ''یہ (رولنگز) ایک بالغ معاشرے کی مثالیں نہیں ہیں بلکہ ایک پاگل ہو جانے والی عدلیہ کی مثالیں ہیں۔'' انہوں نے کہا، ''کانگرس نے کئی برسوں سے عدلیہ کے احتساب کی اپنی

Marfat.com

ذمہ داری پوری نہیں کی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ مقننہ کا ردِّ عمل زیادہ تر شکایتی ہی رہا ہے لیکن لیڈیز اینڈ جینٹلمین دوسرا راستہ بھی ہے، اور وہ ہے عدالتوں پر ہماری آئینی اتھارٹی کی بحالی۔ ہم عدالتیں قائم کرتے ہیں۔ ہم عدالتوں کو توڑ بھی سکتے ہیں۔ ہمیں پورے اختیارات حاصل ہیں۔''

سپریم کورٹ نے بچوں کی سزائے موت ردّ کردی، پبلک پراپرٹی پر احکامِ عشرہ کو نمایاں کر کے لکھوانے کی منظوری نہیں دی، اور ٹیکساس میں میکسکو کے لوگوں کی سزائے موت کے حوالے سے رولنگ دی تو عدالتی معاملات میں براہِ راست مداخلت کے لیے کانگرس میں کئی بل پیش کیے گئے۔ ہاؤس ری پبلکنز نے ایک قرارداد پیش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ آئین کی تعبیر کرتے ہوئے بین الاقوامی قانون کو مدنظر نہیں رکھا جانا چاہیے اور سینیٹ کے ایک بل کے ذریعے وفاقی عدالتوں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ چرچ اور ریاست کی علیٰحدگی سے متعلق تنازعے پر آئین کی پہلی ترمیم کا اطلاق نہیں کریں گی۔ آئینی قانون کی ایک بنیاد وفاقی عدالتوں کا Habeas Corpus اختیار ہے یعنی وہ اس اَمر کا جائزہ لے سکتی ہیں کہ کسی ملزم کو سزائے موت منصفانہ طور پر دی گئی ہے کہ نہیں۔ کانگرس میں بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ یہ اختیار اٹارنی جنرل کو منتقل کر دیا جائے یعنی امریکہ کے چیف پراسیکیوٹر کو!

جب اٹلانٹا کی ایک عدالت میں ایک مشتعل ملزم نے ایک جج کو قتل کر دیا اور شکاگو کے ایک خاتون جج کی ماں اور خاوند کو ایک مقدمہ خارج کرنے پر قتل کر دیا گیا تو ٹیکساس سے ایک ری پبلکن نے سینیٹ چیمبر میں وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اضطراب ''بڑھتے بڑھتے اس سطح پر پہنچ گیا ہے'' کہ ججوں پر تشدد ہو رہا ہے، جو کہ ''سیاسی فیصلے کرنے کے باوجود عوامی احتساب سے ماوراہیں۔'' اگرچہ وہ ایک سابق جج ہیں، تاہم انہوں نے تجویز دی کہ سپریم کورٹ کا کردار اس حد تک محدود کر دیا جائے کہ اسے ''عوام کے منتخب نمائندوں کے سیاسی فیصلوں کو نافذ کروانا چاہیے۔'' عدلیہ کو اس طرح ڈرانے دھمکانے سے بچنے کے لیے ہی ہمارے وطن کے بانیوں نے حکومت کی تین شاخوں کو الگ الگ کر دیا تھا، اس کے علاوہ طے کیا تھا کہ وفاقی ججوں کا تقرر تاحیات ہوگا

Marfat.com

اور نئی عدالتی تقرریوں کی منظوری کے لیے وسیع حمایت ضروری قرار دی تھی۔

امریکی کانگرس کے اس انقلابی پیٹرن اور اعلیٰ انتظامی عہدوں پر خدمات سرانجام دینے کے لیے چنے جانے والوں کے درمیان قریبی مماثلت ہے۔ چند ایک کو ملک میں اور ملک سے باہر سراہا گیا اور ان پر اعتماد کا اظہار کیا گیا تاہم بعض دوسروں کے تقرر نے مخالف ردِعمل کو جنم دیا۔ ایک نہایت دلچسپ معاملہ ایک صاف گو انسان کا بطور انڈر سیکرٹری برائے آرمز کنٹرول تقرر تھا۔ اس کا نام جان بولٹن تھا۔ یہ 2001ء کی بات ہے۔ اگلے برس مَیں دی کارٹر سینٹر کا وفد لے کر ہوانا کے دورے پر گیا تو جان بولٹن نے کیوبا پر جھوٹا الزام لگایا کہ وہ اپنی ادویات کی صنعت کے پردے میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے حیاتیاتی ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ کیوبا نے فوراً پیشکش کی کہ امریکی سائنس دان آکر ادویات بنانے والے کارخانوں کا معائنہ کر لیں لیکن واشنگٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب انٹیلی جنس تجزیہ کاروں نے جان بولٹن کے دباؤ پر اس کے بیان کی تصدیق نہیں کی تو اس نے انہیں ملازمت سے فارغ کرنے یا ان کا تبادلہ دوسرے عہدوں پر کرنے کی کوشش کی۔ اس اقدام سے پتا چلتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے پالیسی ساز لوگوں نے انٹیلی جنس معلومات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا، جو ان غلط دعوؤں کا باعث بنا کر عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بڑے بڑے ذخائر ہیں۔

جان بولٹن نے وزارتِ خارجہ میں رہتے ہوئے امریکہ کی کئی دہائیوں سے چلی آرہی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ اور اسلحے پر کنٹرول کی پالیسیوں کو الٹنے کی کوششیں کیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اسلحے کے حوالے سے معاہدوں کا نظام دوسری عالمی جنگ کے بعد سے چلا آرہا ہے۔ اس نے امریکی قوت کو محدود کر دیا ہے اور بغیر کوئی فائدہ پہنچائے امریکی خودمختاری میں خلل انداز ہے۔ حالانکہ صدر ڈوائٹ آئزن ہاور سے لے کر جارج ایچ ڈبلیو بش تک سبھی نے ان معاہدوں کے لیے ہونے والے مذاکرات میں حصہ لیا تھا۔ بدقسمتی سے جان بولٹن کے مذکورہ بالا مؤقف کے حامی وائٹ ہاؤس میں موجود اس کے افسرانِ اعلیٰ بھی تھے اور اسے امریکہ کی سرکاری پالیسی کے طور پر اپنا چکے تھے۔

Marfat.com

اقوامِ متحدہ کے حوالے سے جان بولٹن کا عوامی سطح پر بیان کردہ فلسفہ طویل عرصے سے تشویش یا تفریح کا باعث بنا ہوا ہے۔ جب اسے اقوامِ متحدہ میں ہمارے ملک کے سفیر کی حیثیت سے متعین کیا گیا تو اقوامِ متحدہ کی ساٹھ سالہ خدمات کی وجہ سے اس کا احترام کرنے والا ہر شخص دنگ رہ گیا۔ اس نے موجودہ بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق عمل کرنے کے حوالے سے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا: ''بین الاقوامی قانون کو منظور کرنا ہماری بہت بڑی غلطی ہے خواہ وہ ہمارے قلیل مدتی مفاد کو کیوں نہ پورا کرتے ہوں .... اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ بین الاقوامی معاہدوں کو حقیقتاً بامعنی سمجھتے ہیں، وہ لوگ امریکہ کو کچلنا چاہتے ہیں۔''

اس نے زور دے کر کہا تھا، ''اقوامِ متحدہ صرف اس وقت قابلِ قدر ہے، جب وہ امریکہ کی بلاواسطہ خدمت کرتی ہو۔'' جب ان سے کہا گیا کہ مذاکرات بین الاقوامی تنازعوں کو سلجھانے کا ایک راستہ ہیں تو انہوں نے جواب دیا، ''مَیں تحفے نہیں دیا کرتا۔''

ان کے اِنہی معروف رجحانات کی وجہ سے امریکہ کے ننانوے ممتاز ترین سفارت کاروں نے ان کے تقرری کی مذمت کی۔ انہوں نے ان کے تقرر کی مذمت اس لیے بھی کہ ان کی کارکردگی ہمارے ملک کے آرمز کنٹرول کے ایک سینیئر ذمہ دار کی حیثیت سے بہت معمولی تھی۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ کی آرمز کنٹرول کے ذریعے قومی سلامتی کو بہتر بنانے کی کوششوں کی ''مخالفت'' کا ان کا ''ریکارڈ غیر معمولی'' ہے۔

پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ بولٹن کے ان رجحانات سے امریکہ کی نئی انقلابی خارجہ پالیسیوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ سفارتکاروں کی طرف سے تشویش کے اظہار کے جواب میں موجودہ اور سابقہ ری پبلکن حکام کے ایک گروپ نے کہا کہ ان کی آراء پر تنقید کرنے والے لوگ ''گمراہ'' ہیں کیونکہ ''جان بولٹن کے خیالات ویسے ہی ہیں جیسے کہ صدر کے ہیں اور ''ایسا لگتا ہے کہ ان کے اختلافات اس شخص کے ساتھ نہیں ہیں، جو کہ صدر کا سب سے مؤثر اور ان کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے والا سب سے فصیح اہل کار ہے، بلکہ خود صدر کے ساتھ ہیں، جنہیں امریکی عوام نے سلامتی کی پالیسیاں وضع

Marfat.com

کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے دو مرتبہ منتخب کیا۔'' صدر بش نے سینیٹ سے جان بولٹن کی نامزدگی کے منظور نہ ہونے کے بعد انہیں تعطیلاتی تقرری پر اقوامِ متحدہ میں بھیج دیا۔

ہماری نئی حکومت کے فلسفے کی صورت گری کرنے والے لوگوں کے لیے عمومی طور پر ''نیو کنزرویٹو'' (Neoconservative) یا ''نیوکون'' (Neocon) کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے۔ ایک بالکل فرسودہ لیکن روایتی ڈکشنری میں اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں: ''ایک سابقہ لبرل جو اعتدال پسند سیاسی کنزرویٹوازم کی حمایت کرے'' یا ''کنزرویٹوازم کو نیا نیا اپنانے والا شخص۔'' میرا پہلی بار کسی ''نیوکون'' سے واسطہ تب پڑا جب صدر ریگن کی نیوکون سفیر برائے اقوامِ متحدہ جین کرک پیٹرک نے یہ کہہ کر میری مذمت کی کہ مَیں دوسرے ملکوں پر ''لبرلائزیشن اور ڈیموکریٹائزیشن کو تھوپنے'' کی کوشش کر رہا ہوں۔

انہوں نے کہا ''یہ یقین غلط ہے کہ حکومتوں کو کسی بھی وقت، کہیں بھی، کیسے بھی حالات میں جمہوری بنانا ممکن ہے۔'' انہوں نے کہا جمہوریت کا انحصار ''پیچیدہ معاشرتی، ثقافتی اور معاشی صورتِ حال'' پر ہوتا ہے، اور یہ ''اگر صدیاں نہیں تو کئی دہائیاں'' لیتی ہے۔ انہوں نے سوموزا کے زیرِ حکمرانی نکاراگوا، مارکوس کے زیرِ حکمرانی فلپائن اور پنوچے کے زیرِ حکمرانی ''روایتی آمریتوں'' کی تعریف کی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ جین کرک پیٹرک کا پہلا سفارتی مشن چلی اور ارجنٹائن کے آمروں کو یہ تسلی دینا تھا کہ میری انسانی حقوق کی پالیسی ان کے لیے زیادہ عرصہ مسئلہ نہیں رہے گی۔

اس وقت سے میں نیو کنزرویٹوز کی تعریف (Definition) کے حوالے سے الجھا رہا ہوں، جنہوں نے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن بیشتر صدور کی سیاسی پالیسیوں کی مذمت کی ہے اور ان کا مستقل اتحاد نہ تو لبرلز (Liberals) کے ساتھ ہے اور نہ کنزرویٹوز کے ساتھ۔ اگرچہ ''نیوکونز'' کی تعریف متعین کرنا مشکل ہے تاہم اب ایسا لگتا ہے کہ وہ خارجہ معاملات میں جارحانہ اور یک طرفہ مداخلت کر رہے ہیں، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا فوجی اور سیاسی اثر ونفوذ بڑھانے کے لیے۔

Marfat.com

اب بعض نیوکونز حکومت کے اعلیٰ ترین مشاورتی مناصب پر فائز ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے پوری دنیا پر امریکی تسلط قائم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور انہوں نے اس استعماری ہدف کو پانے کے لیے پیش بندی کی جنگ (Preemptive War) کو قابلِ قبول قرار دے رہا ہے۔ نائب صدر بننے سے آٹھ سال پہلے رچرڈ چینی نے اپنی ''1990ء کی دہائی کے لیے ڈیفنس سٹریٹیجی'' میں یہ وعدہ کیا تھا۔ اس نے اور اس کے قریبی دوستوں نے 9/11 سے پہلے یا فوری بعد عراق کو پہلے بڑے ہدف کے طور پر چن لیا تھا۔ جس کا ظاہر مقصد اسرائیل کو لاحق خطرے کا تدارک کرنا نیز عراق کو مشرقِ وسطیٰ میں ہمارا مستقل فوجی، معاشی اور سیاسی اڈا (Base) بنانا ہے۔

امریکہ کے اثر ورسوخ کو بڑھانے کے لیے فوجی طاقت استعمال کرنے پر یہ انحصار اور روایتی اقدار سے دوسرے انحرافوں نے دنیا کے لیے ہماری سیاسی، ثقافتی اور مذہبی پیشکشوں کی دلکشی گھٹا دی ہے۔ اگرچہ بیشتر امریکی ہمارے مغربی معاشرے کے ان خواص کی برتری کے قائل ہیں تاہم رفتہ رفتہ یہ زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ انہیں دوسرے لوگوں پر قوت کے ذریعے تھوپنے سے الٹ نتائج پیدا ہوں گے۔

بعض ''نیوکونز'' اور کنزرویٹو مقاصد کے تاریخی ترجمان اب اپنے اِس منصب سے کاملاً انکار کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ نہ تو وہ نئے قدامت پرست ہیں، نہ ہی حالیہ داخلی اور بین الاقوامی حکومتی پالیسیوں سے ان کا کوئی تعلق ہے، جن میں شامل ہے زیادہ بجٹ خسارے، ریاستی اور انفرادی معاملات میں وفاق کی دخل اندازی، اور استعماری مہمات۔ میں نے خصوصیات کے ایک بڑے مجموعے کو بیان کرنے کے لیے ''بنیاد پرست'' کی اصطلاح منتخب کی ہے۔ ان میں سے کچھ خصوصیات ''نیوکونز'' یا انتہائی دائیں بازو والوں میں بھی ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ان اصطلاحات کی کوئی سب کے لیے قابلِ قبول تعریف نہیں ہے۔

واضح طور پر ہماری قوم کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں آراء کا مخلصانہ اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کی توقع بھی کی جانی چاہیے۔ یہ تو مذہب اور سیاست پر بنیاد پرستی کے عدیم النظیر مشترکہ اثر کا نتیجہ ہے کہ ہمارے عوام میں گہری اور وقت کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

بڑھتی ہوئی تفریق و تقسیم پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کے شہریوں کو اس چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا اور اس کا کوئی حل نکالنا ہوگا تا کہ امریکہ کے مستقبل کی روح اور دل کو تخلیق کیا جا سکے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنے مذہبی عقیدے کی فائدہ بخش اقدار اور امن، معاشی اور سیاسی آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے تاریخی آئیڈیلز کو درست طور پر استعمال کریں تو ہماری عظیم قوم کے عالمی اثر و نفوذ کے سارے معقول خواب حقیقت بن جائیں گے۔

Marfat.com

گیارھواں باب

مسخ شدہ امریکی خارجہ پالیسی

اگرچہ امریکہ کی خارجہ پالیسی پر بہت سے دوسرے پیچیدہ سیاسی عناصر نے منفی اثر ڈالا ہے تاہم بنیاد پرستوں نے جذباتی معاملات پر شعلہ بیانی کر کے اور مخالفوں سے مذاکرات سے گریز کر کے امریکی خارجہ پالیسی کی صورت بگاڑ دی ہے۔ ایک اہم مثال یہ ہے کہ چند امریکی سیاسی لیڈروں نے فیدل کاسترو کو ایک ولن کے طور پر قبول کر رکھا ہے، اور انہوں نے کیوبا جیسے چھوٹے سے عسکری اعتبار سے بانجھ ملک کو ہمارے ملک کی سلامتی اور ثقافت کو درپیش سب سے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔

اب سے کوئی 40 سے بھی زیادہ سال پہلے ایک مختصر عرصے کے لیے ایک جائز تشویش تھی۔ اس وقت کے صدر جان ایف کینیڈی کو اطلاع دی گئی کہ سوویت میزائل کیوبا بھیجے جا رہے ہیں۔ اس معاملے کو ''کیوبن میزائل بحران'' کا موزوں نام دیا گیا تھا۔ اس وقت سے کیوبا پر مستقلاً توجہ مرکوز کیے رکھنے کا عمل مضحکہ خیز اور الٹ نتائج پیدا کرنے والا عمل بن چکا ہے۔ کیوبا کے پہلے ہی سے مصائب و مشکلات کے شکار عوام پر معاشی پابندی عائد ہے، کیوبا جانے اور اس سے تجارت کرنے کی ہمارے اپنے شہریوں کی آزادی کو سلب کر لیا گیا ہے، اور ثقافتی اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کیا جانے والا تعاون غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس پالیسی کا واحد نتیجہ یہی نکلا ہے کہ کیوبا کے عوام امریکہ کے مخالف ہو چکے ہیں، کاسترو کو ایک ایسا نجات دہندہ مان لیا گیا ہے جو واشنگٹن کے شیطان سے کامیابی سے نبرد آزما ہے، کاسترو کا آمرانہ اقتدار دوام پا چکا ہے، اور امریکیوں کو ہم نے ان کی آزادیوں سے محروم کر رکھا ہے۔

1977ء میں میزائل بحران حل ہونے کے بعد میں نے سفر کی تمام پابندیاں اٹھا دیں تاکہ کیوبن امریکی اور دوسرے امریکی شہری آزادی سے کیوبا آ جا سکیں، جس

Marfat.com

کے نتیجے میں کیوبا کے جبر زدہ شہریوں سے قلبی روابط قائم ہوں اور وہ اپنے آئین اور قوانین کے مطابق آزادیاں طلب کرنے پر مائل ہوں۔ میں نے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے عمل کا بھی آغاز کیا اور رہوانا اور واشنگٹن میں ''انٹرسٹ سیکشن'' (Interest Sections) یا سرکاری وفود کی منظوری دی۔ میرے بعد صدر بننے والوں نے فلوراڈا کے عسکریت پسند کیوبنز کے دباؤ کی وجہ سے ان فیصلوں کو واپس لے لیا، سوائے اس کے کہ ہم نے جو دفتر ہوانا اور واشنگٹن میں کھولے تھے، برقرار رکھے گئے۔ کم از کم بات چیت کا ایک راستہ تو کھلا رہا۔

2002ء میں مَیں نے فیڈرل کاسترو کی طرف سے کیوبا کے دورے کی دعوت قبول کر لی لیکن صرف تب کہ جب انہوں نے مجھے کیوبن عوام سے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے بلاواسطہ اور بغیر سنسرشپ کے بات کرنے کی ضمانت دی۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی میں کیوبا کی تعلیم اور صحت میں اعلیٰ خدمات کو تسلیم کیا لیکن اس بات پر زور دیا کہ کیوبا کی آزادی اور سیاسی حقوق کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ میں نے واریلا پروجیکٹ (Varela Project) کے نام سے چلنے والی مضبوط اور قابلِ احترام انحرافی تحریک کی حوصلہ افزائی کی۔ کرسچین لبریشن موومنٹ کے سربراہ اوسوالڈ پایا سارڈیناس کیوبن پارلیمنٹ کو پیش کرنے کے لیے ایک پٹیشن پر دس ہزار افراد سے دستخط لے چکے تھے۔ اس پٹیشن میں ملک کے آئین میں تجویز کردہ آزادی کے حق کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے میرے دورے کے بعد سے وائٹ ہاؤس نے امریکی شہریوں کی کیوبا کا سفر کرنے، وہاں کے لوگوں سے خط کتابت اور تجارت کی آزادی سلب کر لی ہے، اس لیے کیوبا میں احتجاج کی آوازوں کو دبا دیا گیا ہے۔

آپ موجودہ امریکی پالیسیوں کے لوگوں پر اثرات کا اندازہ امریکی فوج کے سارجنٹ کارلوس لازو کے معاملے سے لگا سکتے ہیں۔ اس کے دو ٹین ایج بیٹے کیوبا میں ہیں اور اپنے باپ کی طرح امریکہ جانے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ سارجنٹ کارلوس لازو فلوجہ، عراق پر ہونے والے حملے اشتعال انگیز اور مہنگے میں شرکت کے بعد امریکہ واپس آیا تو میامی گیا اور اپنے بیٹوں سے ملنے کے لیے معمول کے مطابق

Marfat.com

درخواست دی۔ نئی پالیسی کے تحت اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ فیملی سے ملنے کے لیے آمد و رفت کی اجازت نہیں دی جائے گی، سوائے ہر تین سال بعد، اور وہ بھی شاید۔ یہ حقیقت پریشان کن ہے کہ اگر امریکی سارجنٹ لازو دنیا کے کسی اور ملک کا شہری ہوتا تو اپنے بیٹوں سے بآسانی مل سکتا تھا۔

ہمارے پورے نصف کرے کے لیے امریکی پالیسی کو اس خبط نے مسخ کر ڈالا ہے۔ اگر کوئی سفارت کار کیوبن عوام کو الگ تھلگ کر دینے کی پالیسی سے نیم پاگلانہ وابستگی ظاہر نہیں کرتا تو اس کے لیے محکمۂ خارجہ میں کوئی اعلیٰ عہدہ پانا ناممکن ہے اور یہ فلسفہ خطے میں امریکہ کے سارے سفارت خانوں پر حاوی ہے۔

کارٹر سینٹر کئی سال سے لاطینی امریکہ میں بیماریوں سے جنم لینے والی تکلیفوں کو کم کرنے اور انسانی حقوق اور جمہوری حکومتوں کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم نے کئی مشکل انتخابات کی مانیٹرنگ بھی کی ہے۔ ہم بہت سے ملکوں کی مقامی سیاسی صورتِ حال سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ہوانا کی آمرانہ حکومت جمہوری اصلاحات کے خلاف ایک اہم اور پریشان کن مورچہ ہے تاہم دوسرے ملکوں کے لیے ہماری حکومت کی مسخ شدہ پالیسیوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان ملکوں میں امریکہ کے خلاف جذبات کی لہر اٹھ رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آمروں کو اقتدار سے نکال باہر کرنا اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو حکومت میں لانا واشنگٹن سے جڑا ہوا ہے۔

آٹھ جنوبی امریکی منتخب صدور کو 2000ء سے ان کے عہدوں سے ہٹایا جا چکا ہے اور لیفٹسٹ لیڈروں کو ان کی جگہ منتخب کر لیا گیا ہے............ جنوب میں چلی اور ارجنٹائن سے لے کر شمال میں وینز ویلا تک بشمول ایکواڈور، برازیل اور بولیویا۔ اب وہ دو تہائی خطے پر حکمران ہیں۔ امریکی پالیسی کے خلاف یہ ردِ عمل یقیناً دوسرے ملکوں میں ہونے والے انتخابات میں اہم کردار ادا کرے گا، بشمول میکسیکو۔

مئی 2005ء میں وینز ویلا کے صدر ہیوگو شاویز کے نامزد کر... امیدوار چلی کے ایک سوشلسٹ جوزے مگیول انسولزا کو آرگنائزیشن آف امریکن سٹیٹس کا سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ امریکہ کی پشت پناہی کے بغیر کوئی امیدوار

Marfat.com

کامیاب ہوا ہو۔

بش حکومت انٹرنیشنل کریمنل کورٹ (آئی سی سی) کے حوالے سے خبط کا شکار ہے، جو کہ ایک اضافی اشتعال انگیز اقدام ہے۔ کارٹر سینٹر کئی سال سے واشنگٹن کے سرکاری حکام اور دوسرے کئی ملکوں کے لیڈروں کے ساتھ مل کر آئی سی سی بنانے کی قرارداد کو بنوانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ جس کا کام روانڈا، یوگوسلاویہ، کمبوڈیا، سیرالیون اور سوڈان جیسے ملکوں میں ہونے والی نسل کشی اور ہولناک جنگی جرائم کو روکنا اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا دینا ہوگا۔ آئی سی سی پر 2002ء میں 139 ملکوں نے دستخط کیے۔ اسے نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا ہے اور امریکیوں کو نسل کشی کرنے پر سزا سے محفوظ رکھا گیا ہے بشرطیکہ امریکی عدالتیں ایسے جرائم کی سزا سنائیں۔ تاہم اب امریکہ اپنے اطاعت گذار ملکوں پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ امریکی فوجیوں، کنٹریکٹر ملازموں اور سیاحوں کو اپنے قانون سے ماورا قرار دے دیں۔ دوسرے خطوں کے ملکوں کے علاوہ 12 لاطینی امریکی اور کیریبیئن ملک فوجی اور دوسری امداد سے محروم ہیں۔ جس سے گہرا اشتعال پیدا ہو رہا ہے اور منشیات، غیر قانونی ترکِ وطن اور دہشت گردی پر قابو پانے میں ان کی ہمارے ساتھ تعاون کرنے کی استعداد اور رضامندی میں خلل پڑ رہا ہے۔

مخالفوں کے ساتھ مذاکرات سے انکار نے ایک اور حساس، مشکل اور خطرناک مسئلے کو جنم دیا، جس میں مَیں براہِ راست ملوث رہا ہوں۔ جون 1994ء میں شمالی کوریا نے انٹرنیشنل ایٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) کے انسپکٹروں کو ملک سے نکال دیا تھا اور یونگبیون میں واقع ایک پرانے گریفائٹ موڈیریٹڈ نیوکلیئر ری ایکٹر کو پلوٹونیم ری ایکٹر میں بدل کر مسئلے کی سنگینی کو بڑھا رہا تھا۔ اس تبدیلی سے وہ ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کے قابل ہو جاتے۔ امریکہ نے اقوامِ متحدہ سلامتی کونسل کو مجبور کیا کہ شمالی کوریا پر سخت پابندیاں عائد کر دی جائیں اور جزیرہ نمائے کوریا پر جنگ کا خطرہ منڈلانے لگا۔

اس اَمر پر کامل اتفاق رائے تھا، اور امریکی فوجی ماہرین بھی متفق تھے کہ جنوبی کوریا اور امریکہ کی فوجیں مل کر شمالی کوریا کو شکست دے سکتی ہیں لیکن اس بات کا

Marfat.com

علم بھی سب کو تھا کہ شمالی کوریا سیئول پر بیس ہزار سے زیادہ میزائل اور بم فوراً برسا سکتا ہے۔ جنوبی کوریا میں امریکی فوجی کمانڈر جنرل گیری لک نے تخمینہ لگایا کہ اس جنگ میں پچھلی کوریائی جنگ کی نسبت زیادہ ہلاکتوں کا امکان ہے۔

شمالی کوریا کے صدر کم اِل سنگ کی طرف سے کئی سال سے ملنے والی دعوتوں اور چینی صدر کی جانب سے گہری تشویش کے اظہار اور صدر بل کلنٹن کی اجازت سے میں اور روزالن پیانگ یانگ گئے۔ ہم صدر کم ال سنگ سے یہ معاہدہ کروانے میں کامیاب ہو گئے کہ شمالی کوریا یونگبیون میں اپنے ایٹمی پروگرام کو بند کر دے گا اور آئی اے ای اے کے انسپکٹروں کو سائٹ پر جا کر یہ معائنہ کرنے دے گا کہ استعمال شدہ ایندھن کو دوبارہ کارآمد نہیں بنایا جا رہا۔ شمالی کوریا کے لیڈر نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ جنوبی کوریا کے صدر کم ینگ سام کے ساتھ بھرپور سفارتی تبادلہ خیال کریں گے۔ جنوبی کوریا کے صدر نے بھی ہمارے پہنچائے ہوئے مذاکرات کے دعوت نامے کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد کم ال سنگ فوت ہو گئے۔ بعد میں ان کے بیٹے کم جونگ ال نے ایک سمٹ کانفرنس کے انعقاد کا وعدہ پورا کیا۔

شمالی کوریا کے ان وعدوں کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اسے یقین دلایا کہ انہیں کوئی فوجی خطرہ نہیں ہے، یونگبیون میں پاور پروڈکشن بند ہونے سے اس کے متبادل کے طور پر تیل فراہم کیا جائے گا، اور دو جدید ایٹمی پاور پلانٹس تعمیر کیے جائیں گے، جن کے فیول راڈز اور آپریشن کو بین الاقوامی انسپکٹر مانیٹر کریں گے۔

یونگبیون میں استعمال شدہ فیول (جس سے نصف درجن بم آسانی سے بنائے جا سکتے تھے) کی نگرانی جاری رہی، تاہم متبادل نیوکلیئر پلانٹس کی تعمیر وعدے کے برخلاف تاخیر میں ڈال دی گئی۔ شمالی کوریا اور امریکہ کے مابین وسیع دوطرفہ مذاکرات ہوئے اور سیکرٹری خارجہ میڈلین البرائٹ نے مشکلات کو سلجھانے کے لیے پیانگ یانگ کا دورہ کیا۔ جنوبی کوریا کے نومنتخب صدر کم ڈائی جنگ نے جزیرہ نما میں امن قائم کرنے کے لیے پہل کی اور شمالی کوریا کے صدر کم جونگ ال کے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی۔ ان کی انہی کوششوں پر انہیں 2000ء میں نوبل انعام برائے امن

Marfat.com

عطا کیا گیا۔

2001ء میں واشنگٹن میں نئی حکومت قائم ہونے کے بعد پوری پالیسی کو ڈرامائی انداز میں بدل دیا گیا۔ شمالی کوریا کو کھلم کھلا ''بدی کے محور'' کا حصہ قرار دے دیا گیا اور اس الگ تھلگ اور دیوانی قوم کو فوجی حملے کی براہِ راست اور بالواسطہ دھمکیاں دی جانے لگیں۔ ایک سرکاری پالیسی کا آغاز کیا گیا جس میں شمالی کوریا کے ساتھ اختلافات ختم کرنے کے لیے براہِ راست مذاکرات سے منع کیا گیا تھا۔ جس تیل کا وعدہ کیا گیا تھا، اس کی ترسیل روک دی گئی، اس کے علاوہ متبادل نیوکلیئر پاور پلانٹس کی تعمیر بھی ملتوی کر دی گئی۔ اوول آفس میں جنوبی کوریا کے صدر کم ڈائی جنگ کے ساتھ ہونے والی سمٹ میٹنگ میں دونوں کوریائی لیڈروں اور ان کی امن قائم کرنے کی کوششوں کا کھلم کھلا مذاق اڑایا گیا۔

پیانگ یانگ نے توقع کے مطابق اس امریکی پالیسی کے جواب میں اعلان کیا کہ وہ این پی ٹی سے نکل رہا ہے، آئی اے ای اے کے انسپکٹروں کو ملک سے نکالا جا رہا ہے، یونگبیون فیول راڈز کی تیاری دوبارہ شروع کی جا رہی ہے، اور وہ ایٹم بم بنا رہا ہے۔ امریکہ نے دعویٰ کیا کہ شمالی کوریا ایٹم بم بنانے کے لیے یورینیم صاف کر رہا ہے، تاہم چینی اور جنوبی کوریائی ماہرین نے اس رپورٹ کی درستی پر شک کا اظہار کیا۔ اگر یہ سچ ہے تو شمالی کوریا کے ایٹم بم بنانے کا فیصلہ سابقہ معاہدوں کی غیر مہذبانہ خلاف ورزی ہے اور خطے کے امن واستحکام کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے۔

پیش رفت میں بنیادی رکاوٹ امریکہ کا مطالبہ ہے کہ شمالی کوریا تمام ایٹمی سرگرمیاں بند کر دے اور دونوں ملکوں کے مابین مذاکرات صرف چھ ملکی فورم میں ہوں گے جبکہ پیانگ یانگ کے لیڈروں کا اصرار ہے کہ براہِ راست دوفریقی مذاکرات بحال کیے جائیں اور واشنگٹن واضح بیان دے کہ امریکی لیڈر ان کے خلاف کوئی ''معاندانہ ارادہ'' نہیں رکھتے۔ شمالی کوریا کے حکام نے 2005ء میں اعلان کیا کہ یونگبیون میں واقع ری ایکٹر کو کوری فیول کر رہے ہیں۔ 2002ء کے بعد سے ایسا اعلان پہلی بار کیا گیا۔ کہا گیا کہ آٹھ ہزار نیوکلیئر فیول راڈز دی جائیں گی جن سے ایٹم

Marfat.com

بم بنائے جاسکتے ہیں۔

سیلگ ہیریسن نوبار شمالی کوریا کا دورہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے تازہ ترین دورہ اپریل 2005ء میں کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''سخت گیر کوریائیوں کے اس رویے کا سبب بش حکومت کی نظریے کی اساس پر بنائی شمالی کوریا پالیسی ہے۔ اسے بدلا جا سکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ امریکہ جنوبی کوریا کے صدر روہ موہیون کی آغاز کی ہوئی مصالحانہ کوششوں میں شریک ہو جائے۔ بہرصورت یہ امر واضح سے واضح تر ہوتا جا رہا ہے کہ حکومت نے دسمبر 2002ء میں ایک المناک غلطی کا ارتکاب کیا تھا کہ یورینیئم الزام کو جواز بنا کر 1994ء کا نیوکلیئر انجماد ختم کر دیا تھا۔ اس سے سخت گیروں کو پلوٹونیم کی ری پروسیسنگ کا جواز مل گیا۔ یوں تازہ بحران رونما ہوا۔''

ہیریسن نے شمالی کوریا کے اعلیٰ مذاکرات کار کانگ سوک جو کا حوالہ دیا۔ میں نے بھی 1994ء میں انہی کے ساتھ مذاکرات کیے تھے۔ ہیری بسن کے بقول ان کا کہنا تھا کہ امریکہ کی طرف سے ایک رسمی بیان کے بعد خفیہ اور کھلے مذاکرات شروع کیے جا سکتے ہیں۔ امریکہ بیان دے کہ وہ ''ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری کا احترام کرے گا اور پرامن بقائے باہم کے لیے تیار ہے۔''

بنیادی عسکری صورتِ حال ویسی ہی ہے جیسی آج سے دس سال پہلے تھی لیکن بہت بری ہے: ہم پورے ملک کو اپنی بے پناہ فوجی قوت سے تباہ کر سکتے ہیں، لیکن اب ایسا یقینی ہے کہ ایٹم بم پھٹنے سے دس لاکھ سے زیادہ جنوبی کوریائی اور امریکی مر جائیں گے۔

غیر عسکری علاقے سے امریکی دستوں کو پرے لے جانے کے حالیہ اعلان سے جنوبی کوریا کی تشویش بڑھ رہی ہے کہ پیانگ یانگ اور واشنگٹن کے سخت گیر لیڈر جنگ شروع نہ کر دیں۔ اپریل 2005ء میں کیے گئے رائے عامہ کے ایک سروے سے

Marfat.com

عیاں ہوا کہ 29.5 فی صد جنوبی کوریائی امریکہ کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں جبکہ 18.4 فی صد نے شمالی کوریا کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ یونیورسٹی سٹوڈنٹس میں سے 50.1 فی صد امریکہ کو جزیرہ نما کوریا میں امن کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

اس مسئلے کے دونوں فریق مضبوط دلائل دے سکتے ہیں، تاہم امریکہ اور شمالی کوریا کے درمیان ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے مذاکرات ضروری ہیں۔ اب تک تو ہم سے اختلاف کرنے والوں سے مذاکرات نہ کرنے کی بنیاد پرستانہ سوچ نے شمالی کوریا کو ہم سے پرے رکھا ہے۔ شاید کمیونسٹ حکومت اسی وجہ سے ایٹمی ہتھیار تیار کر رہی ہے۔ اس دوران ہم نے اپنے مشرقِ بعید کے اتحادیوں کو ناراض کر دیا ہے اور ایشیا میں امریکہ کے اثر و رسوخ اور قد کاٹھ کو گھٹا دیا ہے۔ جب تک امریکہ شمالی کوریا کے بنیادی مطالبے پورے نہیں کرتا اس کا پیچھے ہٹنا یقینی نہیں ہے۔

اگر امریکہ ماضی کی طرح مذاکرات کرے تو ایک معاہدے کا سادہ سا خاکہ تو موجود ہے، ساتھ ہی تمام عناصر کو دوطرفہ اقدامات کے ذریعے مانا جائے گا اور بین الاقوامی انسپکشن بلا رکاوٹ جاری رہے گی:

> ''امریکہ ''معاندانہ ارادہ'' نہ رکھنے کا واضح بیان دے اور اگر شمالی کوریا اپنا ایٹمی پروگرام بند کر دے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن سے رہے تو امریکہ اس کے ساتھ نارمل تعلقات قائم کرنے کی طرف پیش رفت کرے۔
>
> 1994ء کے معاہدے کے بنیادی معیارات کا احترام کیا جائے اور شمالی کوریا، جاپان، جنوبی کوریا، امریکہ، روس اور چین تعاون کریں۔

امکانی مخالفوں کے ساتھ بات چیت نہ کرنے کی بنیاد پرستانہ پالیسی کی ایک اور علامت شام کے حوالے سے امریکی سوچ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں امن کو فروغ دینے کے لیے اور بعض اوقات وائٹ ہاؤس کی درخواستوں پر میں نے اور روزالن نے پہلی مرتبہ 1983ء میں دمشق کا دورہ کیا اور اس کے بعد کئی مرتبہ وہاں گئے۔ ہم نے صدر

Marfat.com

حافظ الاسد کے ساتھ کئی مرتبہ طویل اور اکثر فائدہ بخش گفتگوئیں کیں۔ ہمیں ان کے گھرانے سے واقفیت کا موقعہ بھی ملا۔ ہمیں ان کے بیٹے بشر الاسد سے بھی واقفیت کا موقعہ ملا، جو اپنے باپ کے جانشین کے طور پر جون 2000ء میں شام کے صدر بنے۔

جولائی 2005ء میں فلسطینی انتخاب کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے مجھے مشرقِ وسطیٰ جانا پڑا تو میں نے شام، اُردن اور مصر کے لیڈروں سے بھی اسی دورے کے دوران ملنے کا فیصلہ کیا۔ شام لبنان سے اپنی فوج واپس نکال چکا تھا جبکہ مصر نے کسی نہ کسی شکل میں جمہوری انتخابات کروانے کا اعلان کیا تھا۔ میرا مقصد ان لیڈروں سے ان کے لیے اپنے ذاتی احترام کا اظہار کرنا اور ان کی بدلتی ہوئی ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ میں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن عمل کے لیے ان کی حمایت کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا اور کوئی فائدہ مند خیال یا تجویز چاہتا تھا، جو مَیں فلسطینی لیڈروں سے اپنی طے شدہ ملاقاتوں میں ان تک پہنچا دیتا۔ اس کے علاوہ میں ایسی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جو میری آئندہ کتاب کے لکھنے میں میرے کام آسکیں۔ اس کتاب میں میرا ارادہ اس خطے کے حالات کا تجزیہ کرنے کا ہے۔

میں نے روایت کے مطابق دو ماہ پہلے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور وائٹ ہاؤس کو اپنے سفری منصوبوں سے آگاہ کر دیا۔ مجھے تقریباً فوراً ہی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر کی طرف سے ملاقات کی دعوت موصول ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شام عراق میں خانہ جنگی سمیت چند مسائل پر تعاون نہیں کر رہا اور امریکہ کی پالیسی ہے کہ صدر بشر الاسد پر دباؤ ڈالنے کے لیے کسی امریکی کو دمشق کا دورہ نہ کرنے دیا جائے۔ تھوڑی دیر گرماگرم بحث کے بعد انہوں نے سرکاری طور پر اور صدر کی جانب سے ہمارے دورے کو کینسل کیے جانے کی اطلاع دی۔ میرے لیے یہ ایسا تجربہ تھا کہ جس کی پہلے میری زندگی میں کوئی مثال نہیں تھی۔ تاہم میں اس فیصلے کو ماننے پر مجبور تھا۔

مذہب اور حکومت کا ایک انتہائی عجیب امتزاج امریکہ کی مشرقِ وسطیٰ میں پالیسی پر کچھ عیسائی بنیاد پرستوں کا بھرپور اثر ہے۔ امریکہ میں تقریباً ہر شخص بارہ کتابوں پر مشتمل Left Behind سیریز سے واقف ہے، جس کے مصنف ٹم لا ہے اور

Marfat.com

جیری بی جنیکنس ہیں۔ ان کتابوں نے فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ انہوں نے یہ کتابیں بائبل کی احتیاط سے منتخب کردہ عبارتوں خصوصاً ''بک آف ریویلیشن'' سے لی گئیں عبارتوں کی اساس پر لکھی ہیں اور ان میں دنیا کے ختم ہونے کی منظرکشی کی گئی ہے۔ جب مسیح واپس آئے گا تو سچے ایمان والوں کو آسمان پر اٹھالیا جائے گا جہاں وہ خداوند کے ساتھ، نیچے رہ جانے والے بیشتر انسانوں کی اذیتوں کا نظارہ کریں گے۔ یہ واقعہ لمحاتی ہوگا اور اس کا وقت پہلے سے بتایا نہیں جا سکتا۔ میرے لاکھوں ساتھی بیپٹسٹ اور دوسرے لوگ ایسے ہیں جو اس نظریے پر لفظاً یقین رکھتے ہیں اور خود کو چند منتخب لوگوں میں شامل سمجھتے ہیں اور ''دہشت و اذیت کے دور'' میں نجات کے لیے منتخب نہ کیے جانے والے اپنے افرادِ خانہ، دوستوں اور ہمسایوں کو چھوڑنے اور ان کی مذمت پر تیار ہیں۔

امریکی حکومت کی پالیسیوں میں ایسے نظریات کا سمویا جانا تشویش کا سبب ہے۔ ان ایمان والوں کو یقین ہے کہ اس "Rapture" کی جلد آمد ان کی شخصی ذمہ داری ہے تاکہ بائبل کی پیشگوئی پوری ہو۔ ان کے ایجنڈے میں مشرقِ وسطیٰ میں اسلام (عراق؟) کے خلاف جنگ کرنا اور یہودیوں کا ساری ارضِ مقدس کو چھین لینا شامل ہے (مغربی کنارے پر قبضہ؟)، ساتھ ہی سارے عیسائیوں اور غیر یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد کافر (اینٹی کرائسٹ) اس علاقے کو فتح کرلیں گے اور مسیح آخری فتح پائے گا۔ "Rapture" کے زمانے میں سارے یہودی یا تو عیسائیت قبول کرلیں گے یا انہیں جلا دیا جائے گا۔ انہی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے چند عیسائی لیڈر عراقی جنگ کو بڑھانے میں پیش پیش رہے ہیں، اور بار بار اسرائیل کے دورے کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی مدد کے لیے اسے چندے دیتے رہے ہیں اور فلسطینی علاقے کو نوآبادی بنانے کے لیے واشنگٹن میں لابی کرتے رہے ہیں۔ یہ دائیں بازو کا مذہبی دباؤ تھا کہ امریکہ نے اسرائیلی بستیاں اور مغربی کنارے کے فلسطینی علاقے میں ہائی ویز تعمیر کرنے کو قبول کرلیا۔ چند اسرائیلی لیڈروں نے یہودیوں کی آخری مصیبت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس امداد کو قبول کرلیا۔

Marfat.com

امریکہ گزشتہ چالیس سال کے دوران اسرائیل کی طرف سے یہودی بستیاں بنانے کا مخالف رہا ہے۔ اس کا آغاز ڈوائٹ آئزن ہاور کے دورِ صدارت سے ہوا تھا اور 1993ء تک جاری رہا۔ تب صدر بل کلنٹن نے یہودی بستیوں میں توسیع کی منظوری دے دی۔ صدر جارج ایچ۔ ڈبلیو۔ بش نے یروشلم اور بیت اللحم کے درمیان یہودی بستیاں تعمیر کرنے کی زبردست مخالفت کی، یہاں تک کہ اسرائیل کی مالی امداد میں کمی کرنے کی دھمکی بھی دی۔

اگرچہ مستقبل کے امن مذاکرات میں فلسطینی علاقے میں چند تجاوزات کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر اسرائیل نے اپنے منصوبے کے مطابق پورے غربی کنارے سے مشرقی یروشلم تک مالیہ ایڈومیم نامی بستی تعمیر کر لی تو یہ ''امن کے روڈ میپ'' کی موت ہوگی۔ جبکہ امن روڈ میپ صدر جارج ڈبلیو بش کی مشرقِ وسطیٰ پالیسی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ روڈ میپ برباد ہوا تو یہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے لیے ایک اَلمیہ ہوگا۔

Marfat.com

بارھواں باب

حقوقِ انسانی پرنہیں
دہشت گردی پرحملہ؟

یہ باب لکھنا میرے لیے بالخصوص ناخوش گوار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس میں اُس حکومت کے کچھ ندامت انگیز تجزیے ہیں کہ جس کی مَیں قیادت کر چکا ہوں اَور جس کی اقدار کا دفاع کر چکا ہوں۔ اس تصور نے کہ امریکہ برتر اخلاقی معیارات کا حامل ہے، 9/11 کے حملوں کے فوری بعد اسے دہشت گردی سے لڑائی میں ایک قائدانہ عالمی کردار دے دیا۔ ہماری قوم نے بہت عرصہ پہلے انسانی حقوق کا پرچم بلند کیا تھا، جبکہ سب دوسروں نے اس کی پیروی کی تھی۔ اس کردار کو ''عالمی معاملات میں ایک خود اختیار کردہ مسیحانہ کردار'' کہا گیا تھا۔ ان قومی اقدار کی بحالی اور پھر برقراری کے لیے ضروری ہے کہ امریکی ہمارے اپنے تحفظ کے اہم مقصد کے حصول کے لیے استعمال کی جانے والی پالیسی میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کو سمجھیں۔

میں جنوب میں پروان چڑھا، یہ وہ خطہ ہے جہاں غلامی 250 سال تک زندگی کا ایک غالب حصہ رہی۔ آخر 1868ء اور 1870ء میں امریکی آئین کی چودہویں اور پندرہویں ترمیم کے ذریعے اس کو ختم کر دیا گیا۔ تاہم میرے لڑکپن میں غلامی کی جگہ نسلی امتیاز نے لے لی تھی، جس کی اساس امریکی سپریم کورٹ کی 1896ء کی رولنگ تھی کہ سیاہ فاموں کے ساتھ الگ لیکن برابر والا سلوک قانونی اور قابلِ قبول ہے۔ صدر ہیری ٹرومین نے جرأت سے کام لے کر 1948ء میں امریکی فوج میں قانونی امتیاز ختم کر دیا نیز اس آبدوز میں بھی جس میں مَیں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس کے بعد اگلے بیس برسوں میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی سربراہی اور صدر لنڈن

Marfat.com

جانسن کی لیڈر شپ میں شہری حقوق کی تحریک کے ذریعے پورے ملک میں سیاہ فاموں کے خلاف قانونی امتیاز کا خاتمہ ہوگیا۔

تاہم گھر میں شہری حقوق کی اس فتح کے باوجود امریکہ نے ہمارے نصف کرے اور دوسرے خطوں کی انتہائی ظالمانہ حکومتوں کو قبول کیے رکھا اور ان کی مدد بھی کرتا رہا۔ حالانکہ وہ حکومتیں اپنے شہریوں کے انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہی تھیں۔ میں نے نومنتخب صدر کی حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ انسانی حقوق کا تحفظ ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہوگا اور میں نے اس عہد کو نبھانے کے لیے مستقل کوششیں کیں۔ آزادی کے بنیادی حق کے احترام کے نتیجے میں ہمارے نصف کرّے میں جمہوری تحریکوں کی لہر اٹھی، جس کو دیکھنا انتہائی مسرت انگیز تھا۔

گزشتہ چار برسوں میں ان حقوق کے تحفظ کے لیے ہمارے ملک کی پالیسیوں میں ڈرامائی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے بیشتر شہریوں نے دہشت گردانہ حملوں کے خوف سے ان عدیم النظیر پالیسیوں کو قبول کرلیا ہے، تاہم امریکی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ امریکہ جسے پہلے انسانی حقوق کے ممتاز ترین چیمپیئن کی حیثیت سے تقریباً آفاقی طور پر سراہا جاتا تھا، اَب جمہوری زندگی کے اِن بنیادی اصولوں سے متعلق مؤقر بین الاقوامی تنظیموں کی تنقید کا سب سے بڑا ہدف بن چکا ہے۔

9/11 کے حملوں کے بعد امریکی حکومت نے غیر ضروری ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے پورے امریکہ میں 1200 سے زیادہ بے گناہ افراد کو گرفتار کروالیا، ان میں سے کوئی ایک بھی پہلے کبھی کسی دہشت گردی سے مربوط جرم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ ان کی شناخت راز میں رکھی گئی، اور انہیں اپنے خلاف عائد کیے گئے الزامات سننے کا یا قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقعہ بالکل نہیں دیا گیا، گرفتار ہونے والے تقریباً سارے افراد عرب یا مسلمان تھے اور بیشتر کو امریکہ چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔

شہری آزادیوں کی ایسی پامالیوں کو قانونی روپ دینے کے لیے پیٹریاٹ ایکٹ بہت جلدی میں منظور کیا گیا جبکہ 2005ء میں ختم ہوجانے والے بے شمار ضمنی قوانین عارضی طور پر بنائے گئے۔ پیٹریاٹ ایکٹ کی کچھ شقوں کے نمایاں مخالفوں میں

Marfat.com

بہت قدامت پرست اور مشہور ری پبلکن شامل ہیں جنہوں نے Patriots to Restore Checks and Balances اور Free Congress Research and Education Foundation کے نام سے معروف گروپ تشکیل دیئے ہیں۔ صدر نے اعلان کیا کہ اس قانون کو وسعت دی جائے گی اور اسے مستقل قانون کا درجہ دے دیا جائے گا، تاہم قدامت پرست ''محب الوطن'' بھی اس قانون کی یہ کہتے ہوئے مذمت کر چکے ہیں کہ اس کے تحت وفاقی ایجنٹوں کو لوگوں کے گھروں اور دکانوں کی خفیہ تلاشی، لوگوں کی جائیداد بغیر پیشگی نوٹس اور ڈیڈلائن دیئے قرق کرنے اور امریکی شہریوں کو نوٹس دیئے بغیر ان کی نجی معلومات اکٹھی کرنے کا اختیار مل جائے گا۔ نجی معلومات میں میڈیکل ہسٹری، لائبریریوں سے نکلوائی ہوئی کتابوں اور خریدی ہوئی اشیاء کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔ حکومت کسی ایک شخص کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے کسی ادارے کا پورے کا پورا ڈیٹا بیس .... کسی ہسپتال کا سارا ریکارڈ یا کسی امیگریشن گروپ کی ساری فائلیں .... اپنے قبضے میں لے سکتی ہے۔ پیٹریاٹ ایکٹ کی بیشتر متنازعہ شقوں کی حد میں صرف مشکوک دہشت گرد ہی نہیں آتے بلکہ عام امریکی بھی اس کی لپیٹ میں ہیں۔ اِدھر حکومتی لیڈر اس قانون کو توسیع اور مستقل درجہ دینے کے اعلانات کر چکے ہیں۔

افغانستان اور عراق میں جنگوں کے دوران بالغ مردوں کے علاوہ بہت سے کم عمر لڑکوں کو گرفتار کر کے گوانتانامو، کیوبا میں واقع ایک امریکی قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس قید خانے میں 40 ملکوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً 520 افراد کو قید میں رکھا گیا ہے۔ انہیں اس قید خانے میں تین سال کا عرصہ گذر گیا ہے جبکہ نہ تو ان پر باقاعدہ کوئی الزام عائد کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے۔ کئی امریکی اہلکاروں نے تصدیق کی کہ ان قیدیوں پر جسمانی تشدد کیا جا رہا ہے۔

انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس نے امریکہ کے 25 میں سے 6 قید خانوں کا دورہ کرنے کے بعد رپورٹ دی کہ یہاں اٹھارہ سال سے کم عمر کے 107 قیدیوں کو

Marfat.com

(Hersh نے مئی 2005ء میں اطلاع دی کہ وزیرِ دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ کو موصول ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ''13 سے 15 سال تک کی عمر کے 800 سے 900 پاکستانی بچے حراست میں ہیں۔'' انٹرنیشنل ریڈ کراس، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور پینٹا گون نے بچوں پر جسمانی تشدد کے ٹھوس ثبوت اکٹھے کیے، جن کی تصدیق ایسے فوجیوں نے کی جو اس جرم میں ملوث تھے یا جو اس کے عینی شاہد تھے۔ بچوں کی اپنے ساتھ ہونے والی جسمانی اور ذہنی بدسلوکی کی ذاتی شہادت کے علاوہ ابوغرائب جیل کے سابقہ انچارج بریگیڈیئر جنرل جانس کارپنسکی (Janis Karpinski) نے رپورٹ دی کہ انہوں نے ایک 11 سالہ قیدی بچے کو انتہائی خطرناک (High Risk) قیدیوں کے ساتھ ایک ہی کوٹھڑی میں قید دیکھا۔ جنرل نے لکھا کہ وہ بچہ رو رہا تھا اور ''اس نے مجھے بتایا کہ اس کی عمر تقریباً بارہ سال ہے،'' اور اس نے کہا ''میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں، خدارا مجھے میری ماں سے ملا دیجیے۔'' اس 11 سالہ بچے جیسے بچوں کا ان کے اپنے والدین سے، کسی وکیل سے یا کسی بھی دوسرے شخص سے ملنے کا حق سلب کر لیا گیا ہے۔ انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ انہیں کیوں قید کیا گیا ہے۔ پینٹا گون کے ایک ترجمان نے ہرش کو بتایا کہ ''قید کرتے ہوئے عمر کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔''

ایک تنظیم فزیشن فار ہیومن رائٹس (Physicians for Human Rights) نے اپریل 2005ء میں رپورٹ دی کہ ''امریکہ کم از کم 2002ء سے'' گوانتانامو کے قیدیوں پر ''منظم نفسیاتی تشدد'' کر رہا ہے، جس کی وجہ سے ''قیدیوں کی صحت پر تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔'' وزیرِ دفاع نے اعلان کیا ہے کہ قیدیوں پر کسی دن مقدمہ چلائے جانے اور ان کے بے گناہ ثابت ہو جانے کے باوجود ان میں سے بیشتر کو رہا نہیں کیا جائے گا۔

صدر جارج ایچ۔ ڈبلیو۔ بش کے وائٹ ہاؤس میں ذاتی معالج ڈاکٹر برٹن جے۔ لی سوم نے بیان دیا:

''امریکی فوجیوں کی طرف سے تشدد کی رپورٹوں کے ساتھ یہ شہادتیں بھی ملی ہیں کہ فوجی طبی عملے کے افراد نے بھی اس بدسلوکی میں

Marfat.com

ایک کردار ادا کیا ہے۔ نئے فوجی اخلاقی ضابطے کے مطابق قیدیوں کے علاج میں تاخیر کی اجازت دی گئی ہے، جو کہ ایک جرم ہے۔ یہ نیا اخلاقی ضابطہ روایتی اخلاقی قوانین کو اس طرح مسخ کرتا ہے کہ پہچانے بھی نہیں جاتے۔ اس کا مقصد تفتیش کنندگان کو فائدہ پہنچانا ہے، ڈاکٹروں یا قیدیوں کو نہیں .... حکومت کی طرف سے منظم تشدد کی اجازت اور ہمارے اپنے پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی طرف سے اس میں امداد و اعانت قابلِ قبول نہیں ہے۔ ہیلتھ پروفیشنلز کی حیثیت سے ہمیں عراق، افغانستان، گوانتاناموبے اور دوسری جگہوں پر ہونے والے تشدد کے حوالے سے آزادانہ اور دو جماعتی تفتیشی کمیشن بنانے کے مطالبوں کی تائید کرنی چاہیے۔ ہمیں ان اخلاقی معیارات کی بحالی کا مطالبہ کرنا چاہیے جو فزیشنز، نرسوں، طبی عملے اور ماہرینِ نفسیات کو بدسلوکی کے عمل میں شریک ہونے سے محفوظ رکھیں۔ امریکہ اس راستے پر مزید آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تشدد مضبوطی کی نہیں کمزوری کی علامت ہے۔ یہ سمجھداری، قوت اور بردباری کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ خوف زدہ حکومتی اہل کاروں کا ایک ردِ عمل ہے، جنہوں نے اپنے اور امریکی عوام کے وقار کے منافی جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔''

ابوغرائب جیل، عراق میں کیے جانے والے تشدد کی دہشت انگیز تصویروں نے ہمارے ملک کو بے وقار کر دیا ہے۔ یہ اَمر بالخصوص پریشان کن ہے کہ امریکی انٹیلی جنس افسران نے ریڈ کراس کو بتایا کہ اس جیل میں مقید 70 سے 90 فی صد لوگوں کو غلطی سے گرفتار کیا گیا تھا۔ فوجی حکام نے بتایا ہے کہ 2002ء سے اب تک عراق، افغانستان اور دوسرے خفیہ قید خانوں میں 108 قیدی امریکی حراست میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ جن میں سے کم از کم 28 قیدیوں کو قتل کیا جانا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے کہ ان میں سے صرف ایک ابوغرائب جیل کا قیدی تھا، ظاہر ہوتا ہے کہ کتنے وسیع پیمانے پر تشدد کیا جا رہا ہے اور صرف نئے بھرتی کیے گئے چند سرکش افراد کے اقدامات یا

Marfat.com

فیصلوں تک ہی محدود نہیں۔

عراقی میجر جنرل عبد حامد مہوش نے اپنے بیٹوں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں بغداد میں امریکی افسروں کو رضا کارانہ طور پر گرفتاری دی۔ اسے گرفتار کر کے، اس پر تشدد کیا گیا اور اسے ایک سبز سلیپنگ بیگ میں بند کر دیا گیا، جس میں دَم گھٹنے سے وہ 26 نومبر 2003ء کو مر گیا۔

محکمۂ دفاع نے سطحی تفتیش کروائی، جس میں کسی بڑے فوجی افسر یا حکومتی اہل کار کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے عوامی بیانات اور پرائیویٹ ہدایت نامے انسانی حقوق اور قیدیوں سے سلوک کے بین الاقوامی معیارات کے اطلاق کے حوالے سے تشکیک کو جنم دیتے ہیں اور بعض اوقات مضحکہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

نومبر 2003ء اور جون 2005ء میں دی کارٹر سینٹر نے دوسرے ملکوں پر نئی امریکی پالیسیوں کے منفی اثرات پر متفکر ہو کر کئی درجن ملکوں سے تعلق رکھنے والے انسانی حقوق اور جمہوری تحریکوں کے ممتاز لیڈروں کے اجلاس منعقد کیے۔ ان دونوں اجلاسوں کی صدارت میرے ساتھ اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنروں نے کی جبکہ انسانی حقوق کی دوسری بین الاقوامی تنظیموں نے تبادلۂ خیال میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ان اجلاسوں سے ہم نے جو کچھ جانا، وہ نہایت پریشان کن تھا۔ ایسی رپورٹیں بھی ملیں جن میں بتایا گیا تھا کہ دلیر اور عدم تشدد کے حامی بااثر ایکٹوسٹس نے خطرناک حالات میں دوسروں کے حقوق اور آزادی کا تحفظ کیا۔ اپنی حکومتوں کو انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات اور جمہوریت کے اصولوں کا پابند بنانے کی تحریکیں چلانے پر انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور انہیں سخت ہراساں کیا گیا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ امریکہ کی اپنے ملک کے اندر اور ساری دنیا کے تمام ملکوں میں بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ کرنے کی قدیم پالیسی میں اعلیٰ سطحی، وسیع اور ارادی تبدیلی آ چکی ہے۔ انسانی حقوق کا دفاع کرنے والوں نے 2003ء میں بتایا کہ امریکہ

Marfat.com

نے بہت سے ملزموں کو ایسے ملکوں میں بھیجا ہے جہاں معلومات کے حصول کے لیے قیدیوں پر تشدد کی اجازت ہے۔ امریکی حکومت کی ترجمانی کرنے والے اہل کاروں نے اس الزام کی بھرپور تردید کی۔

ان اجلاسوں کے شرکاء اس بات سے متفق تھے کہ امریکہ کی موجودہ پالیسیاں موقع پرست لوگوں نے اختیار اور مسخ کی ہیں۔ مختلف ملکوں کے لوگوں نے کہا کہ ان کی حکومتیں انسانی حقوق کے اپنے سابقہ وعدوں سے پھر رہی ہیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ان کے ملکوں میں کئی دہائیوں سے جاری جمہوری تحریکوں کی پسپائی کا خطرہ ہے۔

شرکاء نے بتایا کہ جابر حکمران حق کی جرأت کرنے والے شہریوں کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے پردے میں بڑی بے خوفی سے ظلم وستم کا نشانہ بنانے لگے ہیں۔ وہ انسانی حقوق کے حوالے سے امریکی اور دوسری طاقتوں کے دباؤ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بہانے ٹال دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بے شمار وکیلوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں اور صحافیوں کو صرف تنقید کرنے پر یا اپنا روزمرہ کا کام کرنے پر دہشت گرد قرار دیا جا چکا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ صرف ملزموں کا دفاع کرنے پر انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے کئی وکیلوں پر دہشت گردوں کو تحفظ دینے کا الزام لگایا گیا ہے۔

اتنی ہی پریشان کن وہ رپورٹیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ امریکی حکومت بعض دوسرے ملکوں کی حکومتوں کو دہشت گردی کو روکنے کے لیے جارحانہ پالیسیاں اپنانے پر اکسا رہی ہے، جس کے نتیجے میں جمہوری اصول اور قانون کی حکمرانی خطرے میں پڑ گئے ہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی بڑھ گئی ہے۔ امریکی پشت پناہی سے جابرانہ اقدامات کرنے والی حکومتوں کی کارروائیاں پیٹریاٹ ایکٹ کے تحت ہونے والی کارروائیوں سے بھی بڑھ گئی ہیں۔

ہم سب کا حوصلہ اس وجہ سے بڑھا ہے کہ کانگرس میں اور وفاقی عدالتی نظام کے ذریعے نئی امریکی پالیسیوں پر سوال اٹھائے جا رہے ہیں اور یقیناً آخر کار ان میں اصلاح کر لی جائے گی۔ اگرچہ بہت سے قانونی معاملات آخری اپیلٹ سطح پر نہیں پہنچے

Marfat.com

گا تاہم بیشتر ملکی مقدمات کا فیصلہ حق میں ہوا ہے، اور امریکی سپریم کورٹ نے جون 2004ء میں رولنگ دی کہ امریکی وفاقی عدالتیں ''گوانتانا موبے میں قیدیوں پر ہونے والے تشدد کے تناظر میں غیر ملکوں میں گرفتار کیے جانے والے افراد کی گرفتاری سے قانون کو درپیش چیلنج پر غور کرنے کا استحقاق رکھتی ہے۔''

اگرچہ گوانتانا مو کے قیدیوں کے مقدمات کا ازسرِ نو جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا ہے، جس کی وجہ حکومت کا عدم تعاون ہے، تاہم چند قیدیوں سے وکیلوں نے ملاقاتیں کی ہیں تاکہ Habeas Corpus اپیلیں دائر کی جا سکیں۔ امریکی حکومت نے لڑاکوں کی حیثیت کا جائزہ لینے والے ٹریبونلز (CSRT) قائم کر کے سپریم کورٹ کے فیصلے پر پورا عمل نہیں کیا۔ سی ایس آر ٹی تعین کرے گا کہ قیدی ''دشمن لڑاکا'' ہے کہ نہیں۔ سی ایس آر ٹی تین فوجی افسروں پر مشتمل ایک پینل ہے، جو خفیہ شہادتوں کے بل پر یہ طے کرے گا کہ ہر قیدی پر ''دشمن لڑاکے'' کا لیبل لگا رہے یا نہیں۔ جبکہ قیدیوں کو اپنے دفاع کے لیے کوئی قانونی مشاورت دستیاب نہیں ہے۔ یہ پینل قیدیوں کے یہاں پہنچنے کے ڈھائی سال بعد بنایا گیا ہے۔ تاہم یہ اس حوالے سے پہلا قدم ہے کہ ہماری حکومت پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ امریکی حراست میں موجود غیر ملکیوں سے برتاؤ کرتے ہوئے قانونی کی حکمرانی بحال کرے۔

ہماری انسانی حقوق کی کانفرنسوں میں شریک نئی جمہوریتوں سمیت بیشتر ملکوں میں عدالتی نظام میں چیک اینڈ بیلنس اتنا مؤثر نہیں ہے جبکہ بُری پالیسیوں پر سوال اٹھانے اور ان پالیسیوں کو ختم کرنے کا سلسلہ تو بہت کم ہے۔

شمالی آئرلینڈ، ترکی، برما، کولمبیا، اسرائیل، مقبوضہ فلسطینی علاقوں، ازبکستان اور دوسرے تنازعہ زدہ معاشروں سے آنے والوں کے لیے ایک اور موضوع تشویش کا باعث تھا، اور وہ تھا فوجی طاقت کا پیشگی استعمال جبکہ پیش بندی کے لیے کی جانے والی جنگ کی اعلانیہ پالیسی نے اشارہ دیا ہے کہ تنازعات کو حل کرنے کے لیے پُرامن مذاکرات کی بجائے تشدد کو ایک زیادہ قابلِ قبول متبادل تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جمہوریت اور آزادی کے ان ماہروں کا عمومی اتفاقِ رائے یہ تھا کہ تشدد کی اساس پر استوار

Marfat.com

اور آزادی کے ان ماہروں کا عمومی اتفاقِ رائے یہ تھا کہ تشدد کی اساس پر استوار پالیسیوں سے ہمیشہ زیادہ تشدد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ واضح ہے کہ جنگی قیدی سب سے زیادہ آسان شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گرفتار کنندگان کے مکمل کنٹرول میں ہوتے ہیں جبکہ میدانِ جنگ کی نفرت اور سفاکی کا جیل کی دیواروں کے اندر جھلکنا نہایت یقینی ہوتا ہے۔ دوسرے معروف عوامل یہ ہیں کہ جنگ کے دوران ہر کام خفیہ طور پر کرنے کی وجہ سے افسروں کے احکامات اور پالیسیاں اور ماتحتوں کے اقدامات بھی خفیہ رکھے جاتے ہیں نیز نفسیاتی جنگ کے ذریعے قومی نفرت اور خوف میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

خود میرا خاندان ان اثرات کو سہہ چکا ہے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب 1941ء میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے کے ایک ماہ بعد میرے انکل نیوی پیٹی افسر ٹام گورڈی کو جاپانیوں نے گوام میں گرفتار کر لیا اور ان کے ساتھ نہایت سفاکانہ سلوک کیا۔ دو سال تک یہی اطلاعات تھیں کہ وہ ہلاک ہو چکے ہیں لیکن جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ زندہ مل گئے۔ چار سال کے جسمانی اور نفسیاتی تشدد کی وجہ سے ان کا وزن صرف 85 پونڈ رہ گیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران گرفتار شدہ فوجیوں اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی ایسی بدسلوکیوں کی وجہ سے قوموں کی برادری نے جنگی قیدیوں سے مناسب سلوک کی بنیادی ضمانتوں کو متعین کرنے کے لیے مذاکرات کیے۔ 1949ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ''جنیوا کنونشنز'' کی منظوری دی گئی۔ آج تک کسی جمہوری طاقت نے اِن ضمانتوں کو کبھی چیلنج نہیں کیا تھا۔ اب حال ہی میں ایسا ہوا ہے اور وہ بھی امریکہ کی طرف سے! ہمارے سیاسی لیڈروں نے اِن تاریخی پابندیوں کا احترام کرنے کی بجائے ان کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا ہے اور بہانہ یہ بنایا ہے کہ ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ یہ اَمر واضح ہے کہ جنیوا کنونشنز کو جنگی قیدیوں کے تحفظ کے لیے خصوصی طور پر بنایا گیا تھا، امن کے قیدیوں کے لیے نہیں!

Marfat.com

اگرچہ اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کی کامیاب کوششوں سے صرف نچلی سطح کے فوجی افسروں کا ہی احتساب ہوگا اور انہی کو سزا دی جائے گی، تاہم انسانی حقوق کی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیوں کو وائٹ ہاؤس، محکمۂ انصاف اور محکمۂ دفاع میں بحث کے بعد اپنایا گیا تھا............صرف محکمۂ خارجہ نے اختلاف کیا تھا۔ رپورٹوں سے اس طرح کے سرکاری اعلانات کا انکشاف ہوا ہے:

"تشدد سے روکنے والے بین الاقوامی اور ملکی قوانین کے باوجود صدر کو کمانڈر انچیف کی حیثیت سے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تفتیش کے دوران جسمانی اور نفسیاتی تشدد کی اجازت دیں۔"

"میری رائے میں 9/11 کے بعد کے حالات میں جنگی قیدیوں سے تفتیش کے حوالے سے جنیوا کنونشنز کی سخت پابندیاں فرسودہ ہو چکی ہیں جبکہ اس کی بعض شقیں تو بالکل غیر متعلق ہو چکی ہیں۔"

(وائٹ ہاؤس کے قانونی مشیر البرٹو گونزالیز، جو کہ اَب امریکہ کے سب سے بڑے قانون نافذ کرنے والے افسر یعنی اٹارنی جنرل ہیں۔)

شواہد سے عیاں ہوا ہے کہ امریکی لیڈروں نے یہ پالیسی اپنائی ہوئی ہے کہ قیدیوں کو دوسرے ملکوں میں منتقل کر دیا جائے۔ ان ملکوں میں مصر، سعودی عرب، شام، مراکش، اُردن اور ازبکستان شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی مذمت ہماری حکومت اپنی انسانی حقوق کی سالانہ رپورٹ میں کرتی ہے کہ یہ ملک معلومات کے حصول کے لیے تشدد کو وسیلہ بنائے ہوئے ہیں۔ محکمۂ خارجہ نے قیدیوں کو ان ملکوں میں منتقل کرنے کی پالیسی کی مخالفت کی تھی لیکن امریکی حکومت کی سب سے اونچی سطح پر اسے منظور کر لیا گیا۔ یہ پالیسی "غیر معمولی کارکردگی" کے نام سے معروف ہے اور اس کے حوالے سے حکومتی جواز یہ دیئے گئے ہیں کہ قیدیوں کو "غیر قانونی دشمن لڑاکے" قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ ہمارے فوجی اور سی آئی اے اہل کار "یقینی طور پر نہیں جانتے" کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ کانگرس کے اراکین اور قانون کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس غیر معمولی پروگرام میں 150 قیدی شامل تھے۔ قیدیوں پر تشدد کے حربے ناقابلِ بیان حد تک

Marfat.com

بتایا کہ قیدیوں ''کا ایک ہاتھ یا بازو ابلتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔'' اس کے بقول کم ازکم دو قیدی اس طرح جل کر مر چکے ہیں۔

بہت سے معاملات میں سے ایک عوام میں معروف ہو جانے والا معاملہ ایک کینیڈین شہری مہر ایرار (Maher Arar) کی گرفتاری ہے۔ اسے کینیڈی ایئرپورٹ پر ایک ہوائی جہاز سے اتر کر دوسرے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے زنجیریں باندھ کر امریکی ایجنٹوں نے ہوائی جہاز میں بٹھا کر شام پہنچا دیا۔ جہاں اس کے ساتھ ایک سال تک بدسلوکی کی گئی اور پھر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے اسے رہا کر دیا گیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا امریکی حکام کو اس کا علم تھا۔ محکمۂ خارجہ شام میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے پہلے ہی بتا چکا ہے، ''سابقہ قیدیوں اور حراست میں رکھے جانے والے افراد نے بتایا کہ قیدیوں پر تشدد کے طریقوں میں شامل ہے بجلی کے جھٹکے لگانا، ناخن کھینچنا، مقعد میں چیزیں زبردستی گھسانا، مارنا پیٹنا، چھت سے لٹکانا، ریڑھ کی ہڈی کو بہت زیادہ کھینچنا، کرسی پر بٹھا کر پیچھے جھکانا جس سے قیدی کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سرک جاتے ہیں۔''

انسانی حقوق کی خلاف ورزی اپنی جگہ، ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ شدید تشدد کی وجہ سے قیدی ان جرائم کو بھی مان لیتا ہے، جو اس نے نہیں کیے ہوتے۔ تہذیب یافتہ ملکوں میں ایسے اعترافات کو مقدمات کے دوران قبول نہیں کیا جاتا، تشدد یا تشدد کی دھمکی کا بنیادی مقصد جرائم کا اعتراف کروانا نہیں بلکہ خوف پیدا کرنا اور برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ ہمارے بعض لیڈروں نے نیم انسان یا ''دشمن کے لڑاکے'' مانے جانے والے لوگوں کے انسانی حقوق کو سلب کر لینا آسان سمجھ لیا ہے۔

میں امریکہ کے نئے اٹارنی جنرل البرٹو گونزالیز کا حوالہ دوبارہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ اس پالیسی کی وجہ سے ''قیدی دہشت گردوں سے بلد معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، جو امریکی شہریوں پر مزید حملوں سے بچنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔'' انہوں نے غیرملکی قید خانوں میں مشکوک قیدیوں سے سی آئی اے ایجنٹوں کے تفتیش کرنے کے پروگرام میں توسیع کا جواز دیتے ہوئے کہا کہ غیرملکیوں سے امریکی تفتیش

Marfat.com

پر اقوامِ متحدہ کے Convention Against Torture and Other Cruel, Inhuman, or Degrading Treatment or Punishment کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کے بقول قیدیوں کو قانونی کارروائی کے بغیر لامحدود عرصے تک قید میں رکھا جا سکتا ہے اور ریڈ کراس جیسے اداروں کو ان سے ملنے سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ حالانکہ امریکہ ان بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر چکا ہے جن میں ایسے سلوک پر پابندی لگائی گئی ہے۔ نیویارک ٹائمز نے رپورٹ شائع کی ہے کہ صدر بش نے اس پالیسی کو منظور کرنے کے لیے ایک خفیہ ڈائریکٹو 2001ء میں جاری کیا تھا، جسے سرکاری طور پر اب بھی خفیہ رکھا گیا ہے۔ صدر بش نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ القاعدہ کے اراکین اور طالبان جنگی قیدی نہیں ہیں۔

اس نفرت انگیز پالیسی کے حوالے سے ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ جب تشدد کا نشانہ بننے والے قیدی بے گناہ ثابت ہوں تو ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ کیا انہیں آزاد کیا جا سکتا ہے اور کیا انہیں امریکہ کے خلاف شہادت دینے کی آزادی دی جا سکتی ہے یا کیا وہ ہمارے ملک کے خلاف مقدمہ کر سکتے ہیں، جیسا کہ چند لوگوں نے کیا ہے؟ ان میں سے بعض قیدی خصوصی مسئلہ بن گئے ہیں کیونکہ 9/11 کے حملے میں ملوث دہشت گردوں نے انہیں گواہ کے طور پر نامزد کیا ہے۔ ان معروف مجرموں کے مقدمات کو التوا میں ڈالا گیا ہے کیونکہ ہم سابقہ یا موجودہ قیدیوں سے گواہی نہیں لے سکتے ہیں۔

بنیادی مسئلے کو درست کیے بغیر ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیے جا رہے ہیں، جبکہ ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں حقائق تک لوگوں کی رسائی بہت کم ہے۔ ہیومن رائٹس فرسٹ (Human Rights First) کی جانب سے مارچ 2005ء میں جاری کی گئی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عراق اور افغانستان میں گذشتہ صرف چھ ماہ کے دوران، امریکہ کے زیرِ حراست افراد کی تعداد چھ ہزار سے بڑھ کر گیارہ ہزار سے زیادہ ہو گئی اور یہ کہ امریکہ کے لوگوں کو قید کرنے کے پروگراموں کو انتہائی خفیہ رکھا جاتا ہے۔

Marfat.com

قیدیوں سے بدسلوکی کے حوالے سے عوامی جواب دہی میں اضافے کی وجہ سے کانگرس کو سی آئی اے کی سرگرمیوں کی تاریخی رپورٹنگ کے عمل کو قانون سازوں کے ایک بہت چھوٹے گروپ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ قانون کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی سرگرمیوں کے بارے میں کانگرس اور سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹیوں کو آگاہ کیا جائے لیکن وائٹ ہاؤس کا کہنا ہے کہ خفیہ حراستی پروگرام (Secret Detention Program) انتہائی حساس ہے، اس کے بارے میں ہر پینل کے صرف چوٹی کے ری پبلکنوں اور ڈیموکریٹوں ہی کو بتایا جا سکتا ہے۔ دوسرے کمیٹی ممبروں نے اپنے اخراج کا شکوہ کیا تاہم اس پالیسی کو چیلنج کرنے کی ان کی صلاحیت صرف فنڈ روک لینے کی دھمکی سے ختم ہو گئی......... یہ عمل ناپسندیدہ ہے، جبکہ معاملہ قومی سلامتی کا ہے۔

ویت نام میں جنگی قیدی رہنے والے ری پبلکن سینیٹر جان میکین نے امریکی فوجیوں کے قیدیوں سے سلوک پر تنقید کی۔ انہوں نے آرمڈ فورسز کمیٹی کے چیئرمین جان وارنر اور دوسرے ری پبلکن سینیٹروں کے ساتھ مل کر ایسا قانون بنانے کی تجویز پیش کی جو قیدیوں کے ساتھ امریکی فوج کی ''ظالمانہ، غیر انسانی اور تذلیل آمیز سلوک کرنے اور سزا دینے'' اور قیدیوں کو ریڈ کراس سے چھپانے پر پابندی لگا دے گا، اور محکمۂ دفاع کی قید میں موجود ہر شخص سے تفتیش کے یکساں معیار متعین کرے گا۔ ان طاقتور ری پبلکن سینیٹروں نے اعلیٰ عہدے کے پندرہ فوجی افسروں کے تبصرے کا حوالہ بھی دیا ہے: ''قیدیوں سے بدسلوکی نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ پر منفی اثر ڈالا ہے، دشمن کی قید میں جانے والے امریکی فوجیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور یہ نسلوں سے امریکیوں کو عزیز اقدار کے لیے قابلِ نفرت ہے۔'' سینیٹر میکین نے کہا: ''ہم جن دشمنوں سے لڑ رہے ہیں وہ انسانی زندگی یا انسانی حقوق کا ذرا بھی احترام نہیں کرتے۔ وہ ہماری ہمدردی کے حق دار نہیں ہیں۔ تاہم بات یہ نہیں ہے کہ وہ کون ہیں، بات یہ ہے کہ ہم کون ہیں۔''

بش حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے نائب صدر چینی نے اس قانون کو منظور نہ ہونے دینے کے لیے زبردست کوششیں کیں جبکہ وائٹ ہاؤس نے خبردار کیا کہ

Marfat.com

442 ارب ڈالر کے دفاع کے بل کو ویٹو کر دیا جائے گا۔ وائٹ ہاؤس کا کہنا تھا کہ یہ قانون ''امریکی شہریوں کو دہشت گردانہ حملوں سے مؤثر طور پر بچانے اور دہشت گردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے صدر کے اختیار کو محدود کر دے گا۔'' تاہم دباؤ کے تحت وائٹ ہاؤس نے اگست 2005ء میں اعلان کیا کہ گوانتانامو میں قید بیشتر قیدیوں کو افغانستان، سعودی عرب، یمن اور دوسرے مسلمان ملکوں میں منتقل کر دیا جائے گا جہاں کانگرس اتنا سخت معائنہ نہیں کر سکے گی۔

جب ہمارے ملک کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، تب جارج واشنگٹن نے امریکہ میں ایک ''انسانی پالیسی'' تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ 2003ء میں مَیں نے چھ سالہ مطالعے اور تحقیق کے بعد ہماری انقلابی جنگ کے بارے میں ایک ناول لکھا۔ میری ایک سب سے زیادہ ہلا دینے والی دریافت یہ تھی کہ برطانوی افسروں کو اکثر حکم دیا جاتا تھا کہ ہتھیار ڈالنے والے امریکیوں سے ''کوئی رعایت نہ برتی جائے۔'' انہیں مختصر سے مقدمے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال شمال مشرقی جارجیا میں برائیر کریک کی جنگ کی ہے کہ جب یہ حکم اس واضح ہدایت کے ساتھ دیا گیا کہ جو برطانوی فوجی کسی زندہ قیدی کو لائے گا اس کا رم (Rum) کا راشن ایک مہینے تک کے لیے بند کر دیا جائے گا۔ جنرل واشنگٹن نے اس عمل کی مذمت کی اور جنگ کا ایک زیادہ روشن خیال نظریہ پیش کیا۔ اس کے باوجود بعد ازاں پتا چلا کہ چند امریکی انقلابیوں نے بھی ایسے ہی ظالمانہ اقدامات کیے تھے، جو کہ ان کے کمانڈر کی ہدایت کی واضح خلاف ورزی تھی۔

انسانی حقوق کے چیمپئن اپنے ملک کی تاریخی لیڈر شپ سے انحراف کا مشاہدہ ایک ندامت انگیز المیہ ہے۔ جبکہ اعلیٰ عہدے دار اس کا قانونی دفاع کر رہے ہیں۔ یہ صرف امریکی عوام ہی ہیں جو ہماری حکومت کو قانونی، مذہبی اور سیاسی حوالے سے اِن پرانے اور غیر متبدل اخلاقی اصولوں کی طرف واپس لا سکتے ہیں۔

Marfat.com

تیرھواں باب

ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ اور امریکہ کی ذمہ داری

(Non-Proliferation) ایٹمی اسلحہ خانے کو محدود رکھنے اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ایک خصوصی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہے، جس کو نیوکلیئر نان پرولی فریشن ٹریٹی (Nuclear Non-Proliferation Treaty (NPT)) کہتے ہیں۔ اسے پہلے 1970ء میں منظور کیا گیا تھا، اور اب 187 ملک اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں، جن میں وہ پانچ بڑی ایٹمی طاقتیں بھی شامل ہیں، جنہوں نے پہلے ایٹم بم بنائے تھے۔ این پی ٹی کا مقصد ''ایٹمی ہتھیاروں اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کو روکنا، ایٹمی توانائی کے پُرامن استعمال کے لیے تعاون کو بڑھانا، اور ایٹمی اسلحے نیز عمومی اور مکمل طور پر اسلحے کو ختم کرنے کے مقصد کا حصول۔'' ایٹمی اسلحے کی مالک ریاستوں اور ایٹمی اسلحہ نہ رکھنے والی ریاستوں کے مابین یہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کا واحد معاہدہ ہے۔

اعتماد سازی کے اقدام کے طور پر حفاظتی تدابیر کا ایک نظام وضع کیا گیا ہے، جس کو چلانے کی ذمہ داری بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (International Atomic Energy Agency-IEA) بنائی گئی ہے۔ آئی اے ای اے کو اختیار حاصل ہے کہ این پی ٹی پر دستخط کرنے والے ملکوں کی ایٹمی تنصیبات کا معائنہ کر سکے۔ این پی ٹی پُرامن ایٹمی ٹیکنالوجی کی شراکت کو فروغ دیتا ہے نیز ایٹم بم بنانے کے لیے فِسائل میٹریل (Fissile Material) کے نامناسب پھیلاؤ کو روکنے کی کوششیں کرتا ہے۔ این پی ٹی کی ایک اہم شق یہ ہے کہ ہر پانچ سال بعد اس کے کام کا تجزیہ کیا جاتا

Marfat.com

ہے۔این پی ٹی کی ایک اہم شق یہ ہے کہ ہر پانچ سال بعد اس کے کام کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اقوامِ متحدہ میں منعقد ہونے والی ایسی ہر کانفرنس سے پہلے ہم ''دی کارٹر سینٹر'' میں اس کی تیاری کے لیے ایک پیشگی کانفرنس منعقد کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک 2005ء کا تعلق ہے صرف اسرائیل، شمالی کوریا، ہندوستان اور پاکستان نے شرکت نہیں کی۔ ان میں سے تین ملکوں کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کے پاس ایٹم بم ہیں، جبکہ شمالی کوریا کے پاس غیر آزمائش شدہ (Untested) بم ہیں۔

اس وقت دنیا بھر میں تقریباً 30000 ایٹم بم موجود ہیں جن میں سے 12000 ایٹم بم امریکہ کے پاس ہیں۔ روس کے پاس 16000، چین کے پاس 400، فرانس کے پاس 350، اسرائیل کے پاس 200، برطانیہ کے پاس 185 اور ہندوستان اور پاکستان کے پاس 40,40 ایٹم بم ہیں۔ اس اَمر کا یقین کیا جاتا ہے کہ شمالی کوریا کے پاس اتنا نیوکلیئر ایندھن ہے جس سے نصف درجن ایٹم بم بنائے جا سکتے ہیں۔

ایٹمی عدم پھیلاؤ کا معاہدہ ایک ایسا بڑا فورم مہیا کرتا ہے، جس کی مدد سے اقوامِ عالم ایٹمی خطرے کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن امریکی صدر اور بعض دوسرے بین الاقوامی لیڈروں کی وجہ سے این پی ٹی کے مستقبل پر شک کے گہرے سائے پڑنے لگے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں سخت انتباہ کیا گیا ہے:
''ہم ایک ایسے نقطے پر پہنچنے والے ہیں جہاں این پی ٹی کی خلاف ورزی روکی نہیں جا سکے گی جس کا نتیجہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی صورت میں نکلے گا۔''

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ایٹمی اسلحے پر کنٹرول کے لیے جتنے معاہدوں پر مذاکرات کیے گئے ہیں، اب امریکہ ان میں سے تقریباً تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور ایٹمی اسلحے کے عالمگیر پھیلاؤ کا سب سے بڑا مجرم (Prime Culprit) بن چکا ہے۔ سابق وزیرِ دفاع رابرٹ میکنامارا نے مئی/ جون 2005ء کے ''فارن افیئرز'' میں اپنے خدشات کو یوں پیش کیا تھا: ''میں امریکہ کی موجودہ ایٹمی اسلحہ پالیسی کو غیر اخلاقی، غیر قانونی، فوجی اعتبار سے غیر ضروری اور ہولناک حد تک

Marfat.com

این پی ٹی پر دستخط کرنے والے ایسے ملک ،بشمول ایران ،جن کے پاس ایٹمی ہتھیار نہیں ہیں، اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ 1970ء کا معاہدہ انہیں پُرامن مقاصد کے لیے ایٹمی تنصیبات تعمیر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ انٹرنیشنل ایٹامک انرجی ایجنسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی سائٹس کا معائنہ کر کے اس اَمر کو یقینی بنائے کہ وہاں ہتھیار نہیں بنائے جا رہے۔ ''درمیانی ریاستوں'' (Middle States) کا ایک بڑا گروپ ایسا ہے، جس میں شامل سب ریاستوں کے پاس ایٹمی ہتھیار بنانے کے وسائل اور ٹیکنیکل استعداد ہے لیکن انہوں نے خود اس خاص الخاص (Exclusive) ''کلب'' کا حصہ نہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس گروپ میں برازیل، مصر، آئر لینڈ، میکسیکو، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، سویڈن اور ناٹو کے آٹھ اراکین شامل ہیں اور 2005ء کی کانفرنس کی تیاری کے لیے دی کارٹر سینٹر میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں انہوں نے اپنے اولین مقصد کا اظہار یوں کیا: ''ایٹمی طاقتوں پر دباؤ ڈالنا تاکہ وہ این پی ٹی کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری اقدامات کریں۔'' ان کا کہنا ہے کہ امریکہ اور بعض دوسری ایٹمی طاقتیں اپنے ایٹمی اسلحہ خانوں میں کمی کی ذمہ داری پوری نہیں کر رہیں۔ گروپ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اسرائیلی ایٹمی اسلحہ خانے کو بھی زیرِ غور لایا جانا چاہیے۔ ایٹمی اسلحہ بنانے کی استعداد کی حامل ریاستوں نے این پی ٹی کے اطلاق کے صرف پہلے سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی قرارداد پیش کی تو امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔

انٹرنیشنل ایٹامک انرجی ایجنسی نے قرارداد پیش کی کہ ایٹمی ہتھیار بنانے کے دو نارمل طریقوں یورینیم کی نئی ایز چمنٹ اور پلوٹونیم کی نئی ری پروسیسنگ پر پانچ سالہ پابندی لگا دی جائے تو امریکہ نے اس پابندی کی مخالفت ایران کے ساتھ مل کر کی۔ امریکہ کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے ''نیوکلیئر پاور پروجیکٹس کے کام میں خلل پڑنے کا خدشہ ہے۔''

معاملات کی اہمیت کے باوجود نہ تو امریکی صدر، اور وزیرِ خارجہ نے اور نہ ہی ان کے نائبینِ اعلیٰ نے 2005ء میں نیویارک میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں

Marfat.com

شرکت کی۔ امریکہ نے اپنے کسی سینئر افسر کو اس کانفرنس میں نہ بھیج کر ہماری حکومت کو اس حوالے سے بحث کا موضوع بننے سے بچایا کہ وہ این پی ٹی کے مطابق اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے یا نہیں۔

مجھے اپنی صدارت کے زمانے میں ایٹمی اسلحے کے پھیلاؤ کے ایک چیلنج کا سامنا ہندوستان کی طرف سے کرنا پڑا تھا، جو این پی ٹی کی شرائط کو پورا کیے بغیر اپنے ''غیر فوجی (سویلین) نیوکلیئر پاور پروگرام'' کے لیے امریکہ سے ایٹمی مواد اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے باوجود میں نے اس درخواست کو رد کر دیا تھا۔ میرے صدارت کی مدت پوری کرنے کے بعد ہندوستان اس قابل ہوا کہ اپنے منصوبوں کو آگے بڑھا سکے اور 1998ء میں اس نے ایٹم بم کے آزمائشی دھماکے کیے۔ این پی ٹی کی رکنیت کے لیے ایک کلیدی ترغیب یہ ہے کہ اس معاہدے کی شرائط کو پورا کرنے والے رکن ملکوں کو انتہائی حساس نیوکلیئر ٹیکنالوجی تک خصوصی رسائی ہوگی۔ صدر بش نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کی کوششوں کو کمزور کرنے والا ایک اور قدم یہ اٹھایا ہے کہ انہوں نے این پی ٹی کو مسترد کرنے والے ملک ہندوستان پر سے پابندیاں ہٹانے اور اسے محولہ بالا استحقاق مہیا کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ دوسری قوموں کو اکسانے والا واضح اشارہ ہے کہ وہ بھی این پی ٹی کی پابندیوں کی خلاف ورزی کریں۔

امریکی لیڈر دنیا کو عراق، لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کی جانب سے درپیش ایٹمی خطرات سے بچانے کے دعوے کرنے کے باوجود نہ صرف این پی ٹی کی موجودہ پابندیوں کو توڑ چکے ہیں بلکہ انہوں نے نئے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور آزمائش کے منصوبوں پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے۔ ان ہتھیاروں میں اینٹی بیلاسٹک میزائل، ارتھ پینی ٹریٹنگ ''بنکر بسٹر'' اور شاید کچھ خفیہ نئے ''چھوٹے'' ایٹم بم شامل ہیں۔ انہوں نے ماضی کے وعدے بھی توڑ ڈالے ہیں اور ایک بہت پرانی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے غیر ایٹمی ریاستوں کے خلاف ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے میں پہل کی دھمکی دی ہے۔

امریکہ اینٹی بیلاسٹک میزائل ٹریٹی کی پہلے سے عائد شدہ پابندیوں کو توڑتے

Marfat.com

امریکہ اینٹی بیلاسٹک میزائل ٹریٹی کی پہلے سے عائد شدہ پابندیوں کو توڑتے ہوئے ''سٹار وارز'' پروگرام پر 80 اَرب ڈالر خرچ کر چکا ہے۔ ''سٹار واز'' پروگرام امریکہ پر داغے گئے انٹر کانٹی نینٹل میزائلوں کو فضا ہی میں تباہ کر دینے والا ایک کمزور جوازوں اور ناکام کوششوں پر مبنی پروگرام ہے، جس کا خرچ تقریباً 9 اَرب ڈالر سالانہ کے حساب سے بڑھ رہا ہے۔ اس پروگرام کے تین حصے ہیں: دشمن کے میزائل کے داغے جاتے ہی اسے تباہ کرنا، کسی امریکی شہر پر میزائل کے گرنے سے ذرا پہلے اسے تباہ کرنا، (مفروضہ طور پر چین، شمالی کوریا، اور روس) کی طرف سے آنے والے میزائلوں کو ان کی اڑان کے دوران راستے میں کسی جگہ تباہ کرنا۔ حملہ آور میزائل کا پتا چلانے کے لیے خلائی سیاروں میں نصب مانیٹروں یا الاسکا کے ایلوشن آئی لینڈز میں نصب راڈروں یا سمندر میں تیرتے ہوتے ہوئے بہت بڑے پلیٹ فارم پر نصب راڈروں سے کام لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میزائلوں کو درمیان میں تباہ کرنے کی جن ٹیکنیکوں پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے ان میں شامل ہے ہوائی جہازوں سے طاقتور لیزر شعاع کا استعمال، امریکہ کے اہم شہروں کے گرد کنکریٹ کے زمینی مورچوں میں نصب میزائلوں کا استعمال، جو کہ میزائل کی پرواز کے آخری لمحوں میں اسے نشانہ بنائیں گے، اور تیسری ٹیکنیک ہے الاسکا اور دوسرے مقامات سے میزائلوں کو نشانہ بنانا۔

ایک اینٹی میزائل سسٹم بنانے کی ان روب گولڈ برگ کوششوں کو انتہائی بااثر فوجی صنعتی سیاسی قوتوں کی بھرپور تائید وحمایت حاصل ہے نیز چند ایسے لوگ بھی اس کی تائید کر رہے ہیں جن کا ایقان ہے کہ ہر دفاعی کوشش درست ہے، خواہ وہ کتنی ہی مہنگی یا غیر موزوں ہو .... چاہے سوویت روس کے ساتھ سرد جنگ کا زمانہ ہو یا حالیہ زمانے میں دہشت گردانہ حملوں سے دفاع کا معاملہ ہو۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہر صورت میں ہماری مشہور کر دی گئیں کوششوں سے دشمن ڈر جائیں گے۔ سائنس دانوں، اور ذمہ دار و غیر جانبدار فوجی ماہرین کی بھرپور رائے ہے کہ اس پروگرام کے بنیادی مفروضے اور ترجیحات غلط ہیں۔

میزائلوں کو پرواز کے دوران تباہ کرنے کے امریکی فوج کی طرف سے کیے

Marfat.com

جانتے تھے کہ وار ہیڈ کو کب چھوڑا جانا ہے اور اس کا راستہ کون سا ہوگا۔ یہ تو ہیں ممکنہ سادہ ترین حالات جبکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ دشمن کا حقیقی حملہ بغیر کسی پیشگی انتباہ کے ہوگا اور یہ کہ وار ہیڈز کے ساتھ ہمارے انٹرسیپٹرز کو بھٹکانے والے بہت سے میزائل بھی داغے جائیں گے۔

بہر صورت دنیا کے کسی غریب، ترقی پذیر ملک کے لیے یقیناً یہ ناممکن ہے کہ وہ ایٹمی وار ہیڈز اور بین البراعظمی میزائل تیار کر کے، ان کے تجربے کر لے اور پھر انہیں کسی ملک پر داغ دے اور ساری دنیا اس کی اس استعداد سے آگاہ ہی نہ ہو۔ ایک بہت سادہ ٹیکنالوجی یہ ہو سکتی ہے کہ وار ہیڈ کو کسی تھوڑی رینج والے راکٹ یا کروز میزائل پر نصب کر کے ہدف سے چند میل دور سے داغ دیا جائے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ایسے سینکڑوں وہیکلز دستیاب ہیں، بشمول عراق کے بہت زیادہ مشہور کیے گئے اس نوع کے میزائلوں کے۔ ان دونوں طریقوں سے یہ اَمر یقینی ہے کہ حملہ آور میزائل کو شناخت کر کے تباہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی بدمعاش (Rogue) ملک یا تنظیم کے لیے ایسا کرنا بہت آسان ہے کہ وہ ایک چھوٹا، گندا (Dirty) ایٹمی، کیمیائی یا حیاتیاتی ہتھیار بنا کر اسے کسی کارگو کنٹینر یا بغیر کسی سنجیدہ معائنے کے ہر ہفتے نیویارک یا کسی دوسری بڑی امریکی بندرگاہ میں داخل ہونے والے بحری جہازوں میں سے کسی کے ذریعے خفیہ طور پر امریکہ سمگل کر دے۔ اس طرح کا ہتھیار ٹرک پر بھی لادا اور کسی بھی شہر تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حملہ آور کی شناخت مشکل بلکہ ناممکن ہوگی۔

وسائل کا بلا جواز ضیاع اور ترجیحات کا غلط اطلاق احمقانہ پن محسوس ہوتا ہے لیکن اِس کے عالمی نتائج بہت زیادہ سنگین ہیں۔ جب 2001ء میں امریکی لیڈروں نے سرکاری طور پر روس سے کہا کہ ہم اے بی ایم ٹریٹی (ABM Treaty) سے نکل جائیں گے تو اس بات کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ روس اِس کے جواب میں موجودہ آرمز کنٹرول معاہدوں کا پاس کیے بغیر اپنی نیوکلیئر فورسز کو اَپ گریڈ کرنے کے منصوبوں کا اعلان کرے گا۔

Marfat.com

امریکہ کی ایٹمی ہتھیاروں کو ''پہلے استعمال نہ کرنے'' کی پالیسی کے خاتمے پر دوسرے ملکوں کے ردِ عمل کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ چین کے جنرل ژو چینگ ہونے جولائی 2005ء میں اعلان کیا کہ چینی حکومت پر داخلی دباؤ ہے کہ وہ اپنی ایٹمی ہتھیار پہلے استعمال نہ کرنے کی پالیسی کو تبدیل کرے۔ ''اگر امریکہ اپنے میزائلوں اور پوزیشن گائیڈڈ ایمونیشن سے چینی علاقوں کو نشانے پر لے گا تو میرا خیال ہے ہمیں بھی ایٹمی ہتھیاروں سے جواب دینا پڑے گا۔''

صدر ڈوائٹ آئزن ہاور سے لے کر ابھی حال تک ہی تمام امریکی صدور نے ایٹمی اسلحہ خانے کو محدود رکھنے کی سخت کوششیں کیں .... بعض صدور نے دوسرے صدور کی نسبت زیادہ کوششیں کی ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اب کوئی ایٹمی طاقت ایسی نہیں ہے جو جائز اہداف اور تصدیق کے ساتھ مذکورہ بالا اہم مقاصد کے حصول کے لیے کوششیں کر رہی ہو۔ دنیا واشنگٹن سے مثبت لیڈر شپ کے زوردار تقاضے کر رہی ہے جبکہ بہت سے اہم اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امریکہ اور روس کے ایٹمی اسلحہ خانے ابھی تک موجود ہیں اور ان غیر ضروری ہتھیاروں کو کم کرنے کے لیے بہت تھوڑی دو طرفہ کوششیں کی گئی ہیں۔ نیز ان معاہدوں کی لازمی تصدیق اور ایٹمی ہتھیاروں کو تلف نہیں کیا گیا۔ آج جب کہ وسیع ایٹمی اسلحہ خانے نہایت الرٹ حالت میں موجود ہیں، کسی بھی غلطی یا غلط فیصلے سے ایک عالمگیر ہلاکت خیزی کا ویسا ہی امکان ہے جیسا کہ سرد جنگ کے عروج کے دنوں میں تھا۔

روسیوں کے پاس ڈھیروں ڈھیر ایٹمی ہتھیار اور مزید ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے اعلیٰ درجے کا مواد موجود ہے۔ دہشت گرد یا بدمعاش ریاستیں ان کڑی نگرانی میں نہ رکھے گئے ایٹمی ہتھیاروں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ 1991ء میں امریکی سینیٹرز سام نن اور رچرڈ لوگر نے ایک قانون بنوایا جس کے تحت امریکہ اور روس کو ان کے ایٹمی ذخائر کو موزوں طریقے سے ضائع کرنے کے لیے رقوم مہیا کی جا سکیں گی۔ تاہم یہ دانشمندانہ اور مؤثر پروگرام اس وجہ سے خطرے میں ہے کہ فنڈز میں حال ہی میں کمی کر دی

Marfat.com

گئی ہے اور روس کی ایٹمی تنصیبات تک رسائی پر دونوں حکومتیں متفق نہیں ہیں۔ نیز اگر کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو کوئی اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ناٹو (NATO) کے اندر بھی پیش رفت کا اہم موقعہ ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ناٹو اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے کردار پر کم زور دے اور مغربی یورپ میں ان کی تنصیب ختم کر دے۔ مشرق میں ڈرامائی توسیع کے باوجود ناٹو کے پاس ایٹمی اسلحے کے وہی ذخائر موجود ہیں اور اس کی وہی پالیسیاں برقرار ہیں جو اس زمانے کی یادگار ہیں جب براعظم یورپ آہنی پردے سے منقسم تھا اور ناٹو کے آج کے نئے اراکین اس زمانے میں ہمارے ایٹمی میزائلوں کا ہدف تھے۔

ایک اور تاریخی بین الاقوامی عہد کو توڑ دیا گیا ہے، اور وہ عہد یہ تھا کہ موجودہ ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش نہ کی جائے اور نئے ایٹمی ہتھیار نہ بنائے جائیں۔ اگست 1957ء میں صدر آئزن ہاور نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی لگائی جائے اور اس زمانے تک ہونے والی پیشرفت ہی کافی ہے۔ جب میں صدر تھا، اس وقت 150 کلوٹن سے زیادہ کے بم کی آزمائش پر سخت عالمی پابندی عائد تھی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں یہ سب سے چھوٹا دھماکہ تھا جس کو مانیٹر کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد بہت چھوٹے دھماکوں کو مانیٹر کرنا بھی ٹیکنیکی اعتبار سے ممکن ہو گیا اور ایٹمی دھماکوں پر پابندی کا جامع معاہدہ (Comprehensive Nuclear Test Ban Treaty) منظور کر لیا گیا۔ اس کو روس، فرانس اور برطانیہ نے تسلیم کر لیا جبکہ امریکہ اور چین نے اس پر دستخط تو کر دیئے لیکن اسے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ صدر بل کلنٹن نے معاہدے پر دستخط تو کر دیئے اور وعدہ تو کیا کہ اس کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی لیکن پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ امریکہ کے تازہ ترین بجٹ میں امریکہ کے ممکنہ ایٹمی دھماکوں کی فہرست دی گئی ہے، جو کہ سی ٹی بی ٹی کی خلاف ورزی ہو گی۔

امریکی پالیسی میں ایک اور بڑی تبدیلی، جس پر اس کے قریب ترین اتحادی بھی تشویش کا شکار ہو گئے ہیں، یہ ہے کہ امریکہ نے تباہ کن ہتھیار خلا میں نصب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اے بی ایم معاہدہ خلا میں ہتھیاروں کی تنصیب کی مخالفت کرتا ہے لیکن

Marfat.com

فیصلہ کرلیا ہے۔ اے بی ایم معاہدہ خلا میں ہتھیاروں کی تنصیب کی مخالفت کرتا ہے لیکن 2002ء میں ہماری حکومت کی طرف سے اس معاہدے سے انکار کے بعد اس انتہائی عدم استحکام پیدا کرنے والے پروجیکٹ کے لیے دروازہ کھل گیا تھا۔ محکمۂ دفاع کی نئی ڈاکٹرائن میں ہمارے مقصد کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ ''خلا میں اور خلا سے حملے کی آزادی۔'' طے یہ کیا گیا ہے کہ خلا سے زمین پر کسی ہدف کو 45 منٹ میں نشانہ بنایا جائے گا۔ امریکی ائیر فورس نے ایک طریقے کے بارے میں بتایا، جس کا نام راڈز فرام گاڈ (Rods From God) ہے۔ اس طریقے کے تحت خلا سے بھاری دھاتوں کا سلنڈر، جس میں ایک چھوٹا ایٹم بم ہوگا، 7200 میل فی گھنٹے کی رفتار سے ہدف پر داغا جائے گا۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ سرکاری صدارتی حکم نامہ تو جاری نہیں ہوا لیکن پینٹاگون اس منصوبے پر کئی ارب ڈالر خرچ کر چکا ہے۔ حکومت نے جون 2005ء میں پلوٹونیم۔238 کی تیاری شروع کرنے کا اعلان کیا۔ یہ ایک انتہائی تابکار مادہ ہے، جسے صرف خلائی جہازوں کے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ خلائی ہتھیاروں پر پابندی کا ایک عالمی معاہدہ امریکہ کو زیادہ تحفظ دے گا بہ نسبت اس کے کہ وہ یک طرفہ طور پر سب سے پہلے ہتھیار خلا میں نصب کر دے (یقینی بات ہے وہ ایسا کرنے والا واحد ملک نہیں رہے گا)۔

حکومت کے اندر اس اَمر پر گہرے اختلافات کا انکشاف ہوا ہے کہ ہمارے پرانے ایٹمی ذخائر کے کچھ کلیدی اجزا کا کیا کیا جائے۔ ہمارے ملک کے ایٹمی اسلحہ خانے میں تقریباً 5000 کارآمد وارہیڈز موجود ہیں۔ ان میں سے کلیدی ہتھیار ڈبلیو 76 کہلانے والی آب دوزوں پر نصب ہے۔ مَیں اس کے بارے میں پوری طرح جانتا ہوں کیونکہ صدر کی حیثیت سے مجھے اِس کے بارے میں بریفنگ دی گئی تھی۔ اسے سرد جنگ کے دوران ممکنہ حد تک بہت چھوٹی جسامت میں لیکن نہایت طاقتور تیار کیا گیا تھا۔ اسے ایک پتلے اور نازک ڈبے کے اندر رکھا گیا ہے۔ تازہ بحث یہ ہے کہ پرانے وارہیڈز کو بحال کیا جائے یا نئے ماڈل کے وارہیڈز بنائے جائیں۔ اس مسئلے

Marfat.com

دیا جائے۔ یوں اسلحے کی ایک نئی دوڑ شروع ہو جائے گی کیونکہ دوسرے ملک بھی تقریباً یقینی طور پر امریکہ جیسا قدم ہی اٹھائیں گے۔

ایٹمی پھیلاؤ مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا میں عدم استحکام کا ایک اہم سبب ہے۔ ایران اپنے نیوکلیئر پروگرام کے صرف پُرامن ہونے کے دعوے کرتے ہوئے اپنے یورینیئم کی افزودگی کے ارادوں کو مسلسل چھپا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان، پاکستان اور شمالی کوریا یہی وضاحت دے چکے ہیں جبکہ تینوں ملکوں نے ایٹمی ہتھیار بنائے۔ اگر ایران اسی راستے پر آگے بڑھتا رہا تو قیاس ہے کہ امریکہ ''بدی کے محور'' کے ساتھ بلاواسطہ سفارتی کوششیں نہیں کرے گا۔ امریکی لیڈروں کو لازماً یورپی ثالثوں اور فوجی ایکشن کی دھمکیوں پر انحصار کرنا ہوگا۔ اسے ایران کی ایٹمی تنصیبات پر اسرائیل کے حملے کی صورت میں اس کا ساتھ بھی دینا پڑے گا۔

اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں کے کسی کنٹرول میں اور زیرِ نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پڑوسی ملکوں ایران، شام، مصر اور دوسرے عرب ملکوں کے لیڈر ایٹمی ہتھیاروں کی مالک برادری میں شامل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور کئی غیر ایٹمی ملکوں کے تباہ کن اقدامات کا عالمی خطرہ موجود ہے۔ کچھ دہشت گرد گروپوں کی جانب سے بھی کسی تباہ کن اقدام کا خطرہ ہے۔ اس کا انحصار ان ملکوں کی لیڈرشپ پر ہے جن کے پاس طاقتور اسلحہ خانے پہلے سے موجود ہیں لیکن جو اپنے اوپر پابندیاں عائد کروانے پر راضی نہیں ہیں۔ امریکہ اسے پسند کرے یا نہ کرے، یہ اخلاقی فیصلہ کرنا سب سے پہلے اس کا فریضہ ہے۔ دوسروں کے لیے ایک مثال بننے کی بجائے ایسا لگتا ہے کہ ہم ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے حامی بن رہے ہیں۔

Marfat.com

چودھواں باب

پیش بندی کے طور پر کی جانے والی جنگ

2001ء میں خوفناک دہشت گردانہ حملے کے بعد کئی مہینوں تک امریکی عوام کو تقریباً روزانہ چوٹی کے حکومتی افسروں کے یہ بیانات سننے پڑے کہ ہمیں عراق کے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے خطرہ ہے یا یہ کہ ہمیں اپنے ملک میں چھپے ہوئے انتہائی منظم دہشت گردوں سے خطرہ ہے تاہم جیسا کہ ہمارے غیر ملکی اتحادیوں اور ہماری اپنی انٹیلی جنس سروسز کے کلیدی اراکین نے بھرپور زور دے کر کہا تھا امریکہ کو بغداد سے بالکل بھی خطرہ نہیں تھا۔ یہ امر واضح تھا کہ اقوامِ متحدہ کی پابندیوں، ہتھیاروں کی کڑی کھوج اور نگرانی، اور امریکہ کی بے پناہ فوجی برتری کے ہوتے ہوئے صدام حسین کا اپنے کسی ہمسائے کے خلاف جنگ شروع کرنا، وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے کسی ہتھیار کا مظاہرہ یا ایسی کوئی ٹیکنالوجی کسی دہشت گرد تنظیم کو دینا عراق کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ عراق اپنے ہتھیار سازی کے پروگراموں کو، انہیں تباہ کر دینے والی جنگ کے آغاز سے پہلے ہی تقریباً ختم کر چکا تھا۔

اگر صدام حسین کے پاس واقعتاً بہت بڑا نیوکلیئر، حیاتیاتی، یا کیمیائی اسلحہ خانہ ہوتا تو امریکی حملہ سینکڑوں ہزاروں ہلاکتوں کا باعث بنتا ہے، بیشتر امریکی فوجی ہلاک ہوتے۔ اس اَمر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ برطانوی یا امریکی لیڈروں کو حقیقتاً اس طرح کی کوئی توقع تھی یا وہ اس کے لیے تیار تھے۔ ہم اپنے کسی امکانی دشمن ملک یا دہشت گرد تنظیم کی طرف سے ایسے ہتھیاروں کی تیاری کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن غلط یا ارادتاً مسخ کی ہوئی انٹیلی جنس کی بنیاد پر یک طرفہ فوجی ایکشن مسئلے کا حل نہیں ہے۔

Marfat.com

جب میں چھوٹا سا بچہ تھا، اس وقت بھی میں نے ایناپولس میں واقع امریکی نیول اکیڈمی میں جانے، ایک نیول افسر بننے اور اپنی زندگی اپنے وطن اور اس کے اصولوں کے دفاع کے لیے وقف کر دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ میں 1943ء میں نیوی کی ریزرو آفیسر ٹریننگ کور سے ایناپولس گیا اور 1953ء میں استعفیٰ دینے تک خدمات انجام دیتا رہا۔ ریاستوں کے درمیان جنگ میں جنرلوں کی حیثیت سے لڑنے والے صدور اور جنرل ڈوائٹ آئزن ہاور کے سوا مجھ سے زیادہ عرصہ کسی امریکی صدر نے باقاعدہ فوجی ملازمت نہیں کی۔ اگرچہ ایک سب میرین افسر کی حیثیت سے میں ضرورت پڑنے پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا تاہم میں نے اور دوسرے افسروں اور جوانوں نے مل کر عہد کیا تھا کہ امن کے محافظوں کی حیثیت سے ہم امریکہ کی قوت کو اتنا بڑھائیں گے کہ جس کے ڈر سے کبھی جنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ فوجی ملازمت یسوع مسیح .... امن کے شہزادے .... پر میرے عقیدے کی خلاف ورزی ہے۔

بعد میں صدر کی حیثیت سے سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے دوران مجھے اپنے وطن اور اس کے مفادات کے تحفظ کی زبردست ذمہ داری ادا کرنا پڑی۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں دنیا کے تقریباً ہر گوشے میں جاری آزادی اور کمیونزم کے مابین شدید مقابلے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہوں، مجھے ادراک تھا کہ چھوٹی سی لغزش بھی ایٹمی المیئے کا باعث بن سکتی ہے۔ دور دراز کے اہداف تک پرواز کی اہلیت رکھنے والے بمبار طیاروں اور زمین سے داغے جانے والے مہلک بین البراعظمی میزائلوں کے علاوہ ہم نے آب دوزوں کا ایک ایسا بیڑہ بھی تیار کر لیا تھا جو سمندر میں ہمیشہ موجود رہ کر سوویت یونین کی طرف سے پہلے کیے جانے حملے کو روکنے کے لیے ہر وقت تیار رکھی جاتی تھیں۔ صرف ایک بحری جہاز پر نصب وار ہیڈز کے ذریعے ہم سوویت یونین کے ہر بڑے شہر کو تباہ کر سکتے تھے۔

مجھے صدارت کے پہلے ہی دن جن حقیقتوں کو قبول کرنا پڑا، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دشمن کے بین البراعظمی میزائلوں کو داغے جانے کے بعد واشنگٹن، نیویارک اور

Marfat.com

دوسرے اہم امریکی شہروں اور اہداف تک پہنچنے میں صرف 26 منٹ لگیں گے۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اس مختصر سے عرصے میں اپنے جواب کا فیصلہ کرنا میری واحد ذمہ داری تھی۔

کسی آتے ہوئے بین البراعظمی میزائل کو تباہ کرنے کا کوئی ذریعہ کبھی نہیں رہا اور ایٹمی ہتھیاروں کی مالک ریاستوں کے مابین ہونے والا اینٹی بیلاسٹک میزائل ٹریٹی ایسی دفاعی کوششوں سے روکتا تھا۔ ان حالات میں واحد راستہ یہی تھا کہ یا تو جوابی حملہ کر دیا جائے یا بغیر جواب دیئے ہولناک نقصان قبول کر لیا جائے۔ ظاہر ہے میری کوشش یہی تھی کہ اس امکانی منظر سے بچا جائے، جو کہ "MAD" (دوطرفہ یقینی تباہی) کے نام سے مشہور تھا اور اس کے لیے سوویت یونین کو قائل کرنا تھا کہ ہم جواب دینے کی اہلیت اور پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مؤثر سفارت کاری کے ذریعے امن اور امریکی مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔

جس روز میں صدارت کی مدت پوری کر کے جا رہا تھا تو میری کابینہ کے ایک رُکن نے مجھے ایک یادگاری تختی دی تھی، جس پر تھامس جیفرسن کا درج ذیل قول کندہ تھا:

''مجھے اطمینان ہے کہ میری حکومت کے دوران میں جنگ کی تلوار سے کسی ایک شہری کا بھی خون نہیں بہایا گیا۔''

جیسا کہ میں گذشتہ باب میں بیان کر چکا ہوں موجودہ امریکی پالیسی اُن بین الاقوامی معاہدوں کے مؤثر ہونے کے لیے خطرہ بن رہی ہے، جن کے لیے تقریباً تمام سابقہ صدور نے جانفشانی سے مذاکرات کیے تھے۔ عالمی استحکام کو درپیش اس سے بھی بڑا خطرہ پیش بندی کے لیے کی جانے والی جنگ کی پالیسی ہے، جس کی پہلے کبھی مثال نہیں ملتی۔ یہ حالیہ فیصلہ نہ صرف امریکی کی تاریخی پالیسیوں سے انحراف ہے بلکہ ان بین الاقوامی قوانین کی بھی خلاف ورزی ہے جن کے احترام کا ہم وعدہ کر چکے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا دستور خود مختار قوموں کو اپنے انفرادی اجتماعی دفاع کا حق دیتا ہے، لیکن صرف مسلح حملے کی صورت میں۔ ہمارے صدر نے ہمارے قریب ترین اتحادیوں کو بھی نظر

Marfat.com

انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ ''جنگ کو آخری چارۂ کار'' کے طور پر رد کرتے ہوئے فوجی حملوں میں پہل کرے گا۔

ڈینیئل ویبسٹر نے (جسے 4 سال بعد وزیرِ خارجہ نامزد ہونا تھا) 1837ء میں کہا تھا کہ ''فوراً، پوری طاقت سے، ہر ذریعے سے اور غور وفکر میں لمحہ بھر ضائع کیے بغیر اپنا دفاع کرنا ضروری'' ہونا چاہیے۔ سابقہ وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر نے، جو کہ عموماً ری پبلکن حکومتوں کے زبردست حامی ہوتے ہیں، تسلیم کیا تھا کہ پیش بندی کے لیے کی جانے والی جنگ کی پالیسی انقلابی ہے اور ''بین الاقوامی نظام کو چیلنج کرتی ہے۔''

دوسرے ملکوں کو ''بدی کا محور'' قرار دیتے ہوئے انہیں امکانی اہداف قرار دے دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی سفارت کاری کے ذریعے ان کے ساتھ اختلافات کو سلجھانے کے عمومی دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ 2001ء کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد ہمارے لیے ہر ملک نے جو تقریباً یک زبان ہو کر ہمدردی کا اظہار اور حمایت و امداد کا وعدہ کیا تھا، وہ ہماری اس پالیسی کے اپنانے سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم دہشت گردی کے خطرے کو محدود اور کم کرنے کی اپنی طویل اور اہم ترین کوشش میں نسبتاً اکیلے ہو گئے ہیں۔

2000ء کے صدارتی انتخابات کے فوراً بعد یہ واضح ہو گیا کہ ہمارے بعض نئے لیڈروں نے عراق پر حملہ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ 9/11 کے بعد جھوٹے اور مسخ شدہ دعوؤں کے ذریعے انہوں نے امریکی کانگرس اور امریکی عوام کو یہ یقین دلا کر گمراہ کیا کہ صدام حسین ورلڈ ٹریڈ ٹاورز اور پینٹاگان پر حملوں کا ذمہ دار ہے اور یہ کہ عراق ایٹمی اسلحہ اور دوسرے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تیار کر رہا ہے اور امریکہ کی سلامتی کے لیے براہِ راست خطرہ بن چکا ہے۔

اگرچہ بعد میں ان بیانات کی فریب کاری عیاں ہو گئی، تاہم وہ اپنا کام کر چکے تھے اور ہمارے بھروسہ کر لینے والے شہری جنگ کے حامی بن چکے تھے۔ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے غیر موجود ہتھیاروں کے حوالے سے بڑھا چڑھا کر کیے جانے والے اعلانات نے خوف کو برقرار رکھا۔ نائب صدر ڈک چینی مسلسل جھوٹے

Marfat.com

بیانات دیتے رہے مثلاً ''ہزاروں جانیں گنوانے کی بجائے ہم جنگ کے ایک دن شاید دسیوں ہزاروں، یا لاکھوں جانیں بھی گنوا سکتے ہیں۔'' قومی سلامتی کی مشیر کونڈو لیزا رائس نے امریکہ کے شہروں پر کھمبی نما بادلوں کے حوالے دے دے کر نائب صدر کی آواز میں آواز ملائی جبکہ وزیرِ خارجہ کولن پاؤل نے اقوامِ متحدہ جا کر دنیا کے سامنے بے شمار غلط بیانات دیئے۔ حکومت نے بعد میں کہا کہ اس کی معلومات غلط تھیں، تاہم انٹیلی جنس ذرائع کے خلاف تادیبی کارروائی کی بجائے انہیں انعامات سے نوازا گیا۔

یہ بات تھوڑی حیرانی کا باعث ہے کہ خوفزدہ امریکی شہریوں اور کانگرس کے اراکین نے، چند مہینوں کے لیے ہی سہی، تنازعات سلجھانے کے لیے لڑائی نہ کرنے اور سفارت کاری سے کام لینے کی ہماری تاریخی پالیسی پر بھروسہ کرنے کی بجائے اور اس حقیقت کے باوجود کہ وہ امن کے شہزادے یسوع مسیح کو ماننے والے عیسائی ہیں، غیر ضروری جنگ کی حمایت کی۔ میرے اور بیشتر امریکیوں کے لیے امن اور سفارت کاری سے اس وابستگی کا مطلب اندھی یا مکمل امن پسندی نہیں ہے۔ ایسا وقت آتا ہے کہ جب جنگ جائز ہو جاتی ہے اور جبکہ صدیوں سے تشدد کا اخلاقی معیار محتاط انداز میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔

جب یہ اَمر زیادہ واضح ہو گیا کہ ہمارے لیڈر عراق پر حملہ کر دیں گے تو مَیں نے نیو یارک ٹائمز میں ایک مضمون شائع کروانے کا فیصلہ کیا جس میں جنگ شروع کرنے کے کم سے کم تقاضوں کو بیان کیا گیا تھا۔ مَیں نے وہی بنیادی دلیل استعمال کی جسے عیسائی لیڈروں نے (مثال کے طور پر سینٹ آگسٹین نے تقریباً 400ء میں اور سینٹ تھامس ایکوناس نے تیرہویں صدی میں) اس مسئلے کا سامنا کرتے ہوئے کم از کم سولہ سو سال پہلے بالکل واضح طور پر استعمال کیا تھا، اِن کے استدلال کی اساس عہد نامۂ جدید تھا۔

میں نے اس بات سے لاعلمی میں، کہ امریکہ اور برطانیہ کے چوٹی کے لیڈر تقریباً ایک سال پہلے ہی عراق پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، 3 مارچ 2003ء کو یہ الفاظ لکھے تھے:

Marfat.com

منصفانہ جنگ یا غیر منصفانہ جنگ؟

امریکی خارجہ پالیسی میں گہری تبدیلیاں لائی جا چکی ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں سے زیادہ عرصے سے ہمارے ملک کو عظمت عطا کرنے والے دونوں جماعتوں کے پختہ وعدوں سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ یہ وعدے بنیادی مذہبی اصولوں اور بین الاقوامی قانون کے احترام کی اساس پر کیے گئے تھے۔ ہم نے ایسے اتحاد قائم کیے تھے جن کا نتیجہ دانشمندانہ فیصلے اور دو طرفہ احتیاط تھی۔ بین الاقوامی تائید وحمایت کے بغیر عراق کے خلاف جنگ شروع کرنے کا ہمارا ظاہری عزم ان بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

ایک عیسائی اور بین الاقوامی بحران سے حد درجہ اکسائے جانے والے صدر کی حیثیت سے مَیں ایک منصفانہ جنگ کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہوں اور یہ بات واضح ہے کہ عراق پر یک طرفہ حملہ ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ مذہبی لیڈروں کا یہ ایک تقریباً آفاقی ادراک ہے، جنوبی بپٹسٹ کنونشن کے چند ترجمانوں کے انتہائی توجہ طلب استثنا کے ساتھ جو کہ آخری زمانوں کے عقیدے کی وجہ سے اسرائیل کے ساتھ اپنی وابستگی سے بہت زیادہ اثر پذیر ہیں۔

منصفانہ جنگ کی کسوٹی یہ ہے کہ اسے صرف آخری چارۂ کار کے طور پر شروع کیا جا سکتا ہے، جب تمام غیر متشددانہ طریقے آزمائے جا چکے اور ناکام ہو چکے ہوں۔ یہ اَمر ظاہر و باہر ہے کہ واضح متبادل ضرور موجود ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارے سابقہ لیڈروں نے تجویز کیا اور اقوامِ متحدہ نے تسلیم کیا ہے۔ تاہم اب جبکہ ہماری قومی سلامتی کو براہِ راست خطرہ نہیں ہے اور دنیا کی بیشتر حکومتوں اور لوگوں کی مخالفت کے باوجود، ایسا لگتا ہے کہ امریکہ ایک ایسا عسکری اور سفارت کارانہ ایکشن کرنے کا تہیہ کر چکا ہے جس کی تہذیب یافتہ قوموں کی تاریخ میں کوئی مثال

Marfat.com

نہیں ملتی۔

وسیع پیمانے پر عوام کو بتا دیئے جانے والے ہمارے جنگی منصوبے کے پہلے مرحلے میں حملے کے ابتدائی چند گھنٹوں کے اندر اندر عراق کے نسبتاً بے بس عوام پر 3000 بم اور میزائل گرائے جائیں گے، جس کا مقصد عوام کو اتنا نقصان پہنچانا اور خوف زدہ کرنا ہے کہ وہ اپنے گندے لیڈر کو تبدیل کر دیں، جو کہ یقین ہے کہ اس بے پناہ بمباری کے دوران چھپا ہوا اور محفوظ ہوگا۔

جنگ میں ہتھیار استعمال کرتے ہوئے لڑنے والوں اور نہ لڑنے والوں میں فرق کرنا لازمی ہوگا۔ فضا سے وسیع پیمانے پر کی جانے والی بمباری سے، خواہ اسے نہایت درستی سے نشانوں پر پھینکا گیا ہو، ہمیشہ بہت زیادہ ''دوطرفہ نقصان'' ہوتا ہے۔ امریکی فیلڈ کمانڈر جنرل فرینکس نے پیشگی شکایت کی ہے کہ بہت سے فوجی اہداف ہسپتالوں، سکولوں، مسجدوں اور مکانوں کے قریب ہیں۔

جنگ کے دوران اتنا ہی تشدد کرنا ہوگا، جتنا کہ کسی فریق پر کیا گیا ہوگا۔

بلاشبہ صدام حسین نے دوسرے جرم کیے ہیں تاہم 9/11 کے دہشت گردانہ حملوں سے عراق کا تعلق ثابت کرنے کی امریکی کوششیں قائل کرنے والی نہیں ہیں۔

حملہ کرنے والوں کو اپنے معاشرے کی طرف سے قانونی جواز لازماً حاصل کرنا ہوگا۔ سلامتی کونسل میں کامل اتفاقِ رائے سے عراق کے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو برباد کرنے کی قرارداد کا احترام کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے اعلان کردہ اہداف تو اب یہ ہیں کہ صدام حکومت کو بدلا جائے گا اور اس کی جگہ خطے میں امریکہ کی حامی حکومت قائم کی جائے گی اور شاید نسلی طور پر منقسم ملک پر دس سال کے لیے قبضہ کیا جائے گا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہمارے پاس بین

Marfat.com

الاقوامی اتھارٹی نہیں ہے۔ سلامتی کونسل کے دوسرے ملک اَب تک واشنگٹن کا بہت زیادہ معاشی اور سیاسی دباؤ برداشت کرتے آئے ہیں اور اَب امکان ہے کہ ہمیں ضروری ووٹ نہیں مل پائیں گے یا روس، فرانس اور چین میں سے کوئی ویٹو کر دے گا۔ ممکن ہے ترکی کو بہت بڑے مالی انعام، کردوں اور شمالی عراق کے تیل پر جزوی کنٹرول کی ترغیب دے کر حامی بنا لیا جائے تاہم کم از کم ترکی کی جمہوری پارلیمنٹ نے تشویش کے عالمی اظہار میں اس کی آواز ضرور شامل کر دی ہے۔

امن قائم کرنے کے بعد لازم ہے کہ حالات پہلے سے بہتر ہوں۔ امیدیں تو بہت ہیں کہ عراق میں امن اور جمہوریت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ تاہم یہ عین ممکن ہے کہ کامیاب فوجی حملے سے خطہ عدم استحکام کا شکار ہو جائے اور شاید بھڑکے ہوئے دہشت گرد ہمارے لوگوں کے ذاتی تحفظ اور ہماری قوم کی سلامتی کی طرف سے توجہ پھیر لیں۔ اس کے علاوہ بھرپور عالمی اختلاف کی پروا نہ کرنے سے اقوامِ متحدہ کی حیثیت بطور عالمی امن قائم کرنے والے ایک فعال ادارے کے بُری طرح مجروح ہو گی۔

9/11 کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد جو دلی ہمدردی اور دوستی ہمیں حاصل ہوئی تھی، حتیٰ کہ سابقہ دشمن ملکوں کی طرف سے بھی، اب بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے، اور بڑھتی ہوئی یک طرفہ اور غلبہ پسندانہ پالیسیاں ہمارے ملک کو بین الاقوامی سطح پر بداعتمادی اور نفرت کی پست ترین سطح پر لا چکی ہیں۔ اگر ہم نے اقوامِ متحدہ کی واضح مخالفت کے باوجود جنگ شروع کر دی تو ہماری حیثیت مزید مجروح ہو گی۔ تاہم اگر ہم عراق کو اقوامِ متحدہ کی تمام قراردادوں کے مطابق عمل پر مجبور کرنے کے لیے اپنی فوجی موجودگی کو استعمال کرتے رہیں گے........ اور آخری چارۂ کار کے طور پر جنگ بھی شامل ہے........ تو اس سے امن

Marfat.com

اور انصاف کے چیمپیئن کی حیثیت سے ہماری ساکھ بہتر ہوگی۔''

جنگ سے پہلے اس اور اس جیسے دوسرے بیانات کے باوجود امریکہ نے طاقت کے استعمال کے خلاف بین الاقوامی پابندیوں کو توڑتے ہوئے عراق پر بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اس تنازعے کے نتائج کے حوالے سے کسی کو کبھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا کیونکہ دس سال سے زیادہ عرصے سے عراق پر سخت بین الاقوامی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ جدید ترین ہتھیار حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ امریکہ کے فوجی بجٹ کے ہر تین ڈالر کے مقابلے میں عراق صرف ایک سینٹ (Cent) خرچ کر رہا تھا۔ المناک مغالطہ یہ تھا کہ ہمارے بہادر فوجی جوانوں کے آزاد عراقیوں کی جانب سے گرم جوش استقبال کی تصویر کشی کی گئی۔ اس کی بجائے ہمیں 1700 فوجی جوانوں کی ہلاکتوں کا صدمہ سہنا پڑا، اس میں سے 93 فی صد ہلاکتیں بغداد پر قبضے کے بعد سے ہوئی ہیں۔

صدام حسین کے گرفتار ہونے سے پہلے امریکی فوج کا جانی نقصان اوسطاً 45 ہلاکتیں فی ماہ تھا، جو بڑھ کر 78 ہلاکتیں فی ماہ ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ امریکی میڈیا ان ہلاکتوں کی طرف سے بے حس لگتا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کے محتسب نے تسلیم کیا کہ ''اپریل کی پہلی تاریخ سے لے کر جون کی 23 تاریخ تک کے درمیانی عرصے میں عراق میں 193 فوجی جوان ہلاک ہو چکے ہیں لیکن اس حوالے سے صفحۂ اوّل پر ایک شہ سرخی بھی نہیں لگائی گئی جیسے یہ کوئی خفیہ معاملہ ہو۔''

ہماری حکومت کا ایک سب سے زیادہ عجیب فیصلہ امریکیوں کے جانی نقصان سے عوام کو لاعلم رکھنا ہے۔ ہمارے لیڈر شاذ ہی زخمیوں کا ذکر کرتے یا ان کی عیادت کرنے جاتے ہیں اور ڈوور ایئر فورس بیس ڈیلاویئر کے مضافاتی قبرستان میں پہنچائے جانے والے تابوتوں کے بارے میں عوام کو خبر نہ ملنے دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ہلاک ہونے والے فوجی جوانوں کی اُن ماؤں اور بیویوں کی جانب سے مقدمات دائر کیے جا چکے ہیں، جنہیں ڈوور یا دوسرے فوجی اڈوں پر اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھنے نہیں دی گئیں۔

ہم اور ہمارے اتحادی برطانوی فیصلہ کر چکے ہیں کہ سویلین ہلاکتوں کو شمار

Marfat.com

نہیں کیا جائے گا جبکہ حقیقی اور مطبوعہ اعداد و شمار میں بہت فرق ہے۔ برطانیہ کے ایک مؤقر طبی جریدے "لینسیٹ" (Lancet) نے رپورٹ دی ہے کہ اتحادی فوجوں (خصوصاً ایئر فورس) نے ایک لاکھ غیر فوجی عراقیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ امریکی سرکاری ذرائع نے صرف 24000 کا تخمینہ لگایا ہے یعنی صرف انہی ہلاکتوں تک محدود رکھا ہے جن کی خبریں مغربی ذرائع ابلاغ دے چکے ہیں۔ اصل تعداد ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔

امریکی فوجی آپریشنز کے دوران ہلاک ہونے والے عراقیوں کے علاوہ عام عراقی شہری اور پولیس افسر اگست 2004ء سے مئی 2005ء کے درمیان ہر ماہ 800 کی شرح سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ اعداد و شمار جون 2005ء میں عراق کی وزارتِ داخلہ نے جاری کیے تھے۔ جنوری میں ہونے والے الیکشن کے بعد ہلاکتوں کی شرح بڑھ گئی ہے۔

جانی نقصان کی درست شرح کے مسئلے کے علاوہ دو بنیادی حقیقتوں کو یاد رکھنا ضروری ہے: اول، جنگ نامنصفانہ اور غیر ضروری تھی۔ دوم، عراق میں موجود ہماری مسلح افواج اپنی خصوصی جرأت اور مؤثر پن کی وجہ سے غیر معمولی داد و تحسین کی حق دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی خطرے یا بحران کے دیگر زمانوں کے برعکس ریاست ہائے متحدہ امریکہ حالتِ جنگ میں نہیں ہے۔

تنازعے کا سارا بوجھ ایک غیر معمولی درجے تک صرف چند فوجیوں اور ان کے گھرانوں پر ہے، جبکہ 99.5 فی صد امریکی عوام نے نہ تو مالی قربانی دی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی بے آرامی سہنا پڑی ہے۔ عراق کو کویت سے نکالنے کے محدود مقصد کے تحت ہونے والی پہلی خلیجی جنگ میں پانچ لاکھ فوجی شامل تھے جبکہ اس مرتبہ اس تعداد کے صرف ایک تہائی کو ایک بڑے اور پیچیدہ ملک کو فتح کرنے اور قبضے میں رکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

جنگ میں زندہ بچ جانے والوں کی ان کی حق کے مطابق بہت تعریفیں کی جاتی ہیں تاہم جب ہمارے سب سے بڑے بیٹے نے کالج چھوڑ کر فوج میں رضا کارانہ طور

Marfat.com

پر بھرتی ہونے اور ویت نام جانے کا فیصلہ کیا تھا تو ہمارے گھرانے کو مختلف قسم کی کشمکش سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ ایک نہایت غیر مقبول امریکی ایڈونچر تھا۔ مجھے یاد ہے، جب ہمارا بیٹا جیک مختصر فوجی چھٹی پر آتا تو اس کے ساتھی اور سابق ہم جماعت اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہ اسے بے وقوف اور بھولا کہتے تھے۔ وہ اپنی وردی نہ پہننے کو ترجیح دیتا تھا۔ ویت نام جنگ ختم ہونے کے کئی سال بعد ان بہادر جوانوں کو آخرِ کار ہیرو کے طور پر عزت دی گئی۔

پوچھنے کو ایک بنیادی سوال یہ ہے، ''کیا عراقی جنگ نے دہشت گردی کے خطرے کو کم کر دیا ہے؟'' بدقسمتی سے جواب ہے ''نہیں۔'' ہم نہ صرف 9/11 کے حملے کے بعد ساری دنیا سے ملنے والی ہمدردی اور حمایت کھو چکے ہیں بلکہ اس اَمر کا بلاواسطہ ثبوت موجود ہے کہ عراقی جنگ نے دہشت گردی کے خطرے کو بڑھا دیا ہے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر پورٹر گوس نے کانگرس کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بتایا، ''اسلامی انتہا پسند عراقی تنازعے کو استعمال کر کے نئے امریکہ مخالف جہادیوں کو بھرتی کر رہے ہیں .... جو جہادی عراق سے زندہ بچ نکلیں گے وہ شہری دہشت گردی میں تجربہ کار ہوں گے۔'' انہوں نے مزید کہا کہ جنگ ''انتہا پسندوں کے لیے ایک کاز (Cause) بن چکی ہے۔''

ان کی رائے کی توثیق کرتے ہوئے امریکہ کے نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم سینٹر (U.S. National Counterterrorism Center) نے رپورٹ دی کہ 2004ء میں بین الاقوامی دہشت گردی کے سنگین واقعات کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہو گیا۔ بڑے حملوں کی تعداد 650 سے زیادہ ہو گئی جبکہ 2003ء میں 175 بڑے حملے ہوئے تھے۔ عراق میں بھی دہشت گردی کے واقعات میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور ان کی تعداد 22 سے بڑھ کر 198 ہو گئی، پچھلے سال کے مجموعی حملوں سے نو گنا زیادہ .... عبوری عراقی حکومت کو امریکہ کی طرف سے اقتدار منتقل کیے جانے کے بعد۔ یہ اَمر واضح ہے کہ جنگ نے عراق کو دہشت گردی کا دنیا کا سب سے مؤثر ٹریننگ کیمپ بنا دیا ہے۔ شاید طالبان کے زیرِ حکومت افغانستان سے بھی زیادہ خطرناک۔ اس کے علاوہ

Marfat.com

ہم عراق کو ایک مستقل اڈہ بنا کر ایران اور شام پر دباؤ ڈالنے کے قابل بھی نہیں ہو سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ نئی عراقی حکومت اور اس کے بنیاد پرست شیعہ ہمسایوں کے درمیان تعلق مضبوط ہو رہا ہے، جس سے مشرقِ وسطیٰ میں ایران کی سٹریٹیجک پوزیشن کو بہت زیادہ استحکام ملے گا۔

امریکہ پیش بندی کے طور پر کی جانے والی جنگ کی پالیسی اپنا کر موجودہ معاہدوں اور اتحادیوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے کیونکہ وہ سپر پاور کی حیثیت سے ہمارے یک طرفہ ایکشن کرنے کی آزادی میں غیر ضروری رکاوٹ تھے۔ اس پالیسی کا ایک اور سنگین نتیجہ یہ امکان ہے کہ دوسرے جارحیت پسند ملک بھی اپنے ناپسندیدہ لیڈروں کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے حملہ کرنے کی ایسی ہی پالیسی اپنا لیں گے۔

جب امریکہ نے 2005ء کے شروع میں عراق میں جمہوریت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو شیعہ مسلمانوں اور کردوں نے سُنی منحرفین اور دہشت گرد گروپوں کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود جرأت کا اور آزادی سے وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی تعداد میں ووٹ ڈالے۔ اگلے مراحل یعنی آئین کو تحریر کرنے اور پھر ایک نمائندہ حکومت تشکیل دینے کے حوالے سے میں اس وقت یہ کتاب لکھتے ہوئے تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا تاہم اس حوالے سے بہت زیادہ تشویش پائی جاتی ہے کہ سُنی تعاون کریں گے یا نہیں، اور یہ کہ مذہبی قوانین کتنے غالب ہوں گے؟ حکمران شیعہ جماعتیں مطالبہ کر رہی ہیں کہ شادی، طلاق اور وراثت کے معاملات میں شریعت کو اعلیٰ ترین اتھارٹی ہونا چاہیے۔ اگر عورتوں کے حقوق، جو کہ صدام حسین کے دور میں محفوظ تھے، امریکہ کی سرپرستی اور حفاظت میں قائم ہونے والی نئی ''جمہوری'' حکومت کے دور میں ختم ہو جائیں گے تو یہ ستم ظریفی ہو گی۔

اگر کامیابی کو حقیقت بنایا جا سکے تو یہ ایک اہم کارنامہ ہو گا، اور غیر یقینی پن کے بڑھنے اور دہشت گردوں کے جوش میں اضافے کے باوجود عراق میں جمہوریت لانے کی یہ کوشش عالمی تائید و حمایت اور امداد کی حق دار ہو گی۔

اس اَمر میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ کو عراق سے فوجیں نکالنے سے پہلے

Marfat.com

اپنے بنیادی مقاصد لازماً پورے کرنے چاہئیں۔ تاہم ان مقاصد کو کبھی واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ یہ اَمر یقینی ہے کہ فریب سے نکل آنے والے امریکی عوام کی طرف سے ڈالا جانے والا سیاسی دباؤ امریکہ کو کم سے کم مقاصد کے تعین اور فوجوں کی واپسی کا ٹائم شیڈول بنانے پر مجبور کرنے والا ایک اہم عامل ہوگا۔ ہمیں عراقی عوام کو پانی، نکاسی آب، ذرائع مواصلات، بجلی اور تیل نکالنے اور بیچنے کی اہلیت مہیا کرنی چاہیے۔ عراقیوں کی ویسی ہی مؤثر سیکورٹی فورس ضرور ہونی چاہیے، جیسی کہ ہم تباہ کر چکے ہیں۔ یہ سیکورٹی فورس ایک مستحکم اور جمہوری حکومت کی مدد کرے گی۔

ایک بنیادی سوال جو آخری حاصل (Final Outcome) کا تعین کرے گا، یہ ہے کہ کیا امریکی لیڈر عراق میں مستقل فوجی اڈوں کے قیام اور معیشت پر غلبہ پانے پر اصرار کریں گے یا یہ واضح کریں گے کہ ہم نے اپنے فائدے کے لیے مستقل موجودگی کو برقرار رکھنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا۔

حیرانی اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ خطے کے بیشتر عرب جمہوری کوشش کے میرے پسندیدہ اندازے سے متفق نہیں ہیں۔ زوگبی انٹرنیشنل نے مصر، سعودی عرب، مراکش، اُردن، لبنان اور متحدہ عرب امارات میں سروے کرنے کے بعد مارچ 2005ء میں رپورٹ دی کہ عربوں کی اکثریت اس اَمر پر یقین نہیں رکھتی کہ امریکہ کی عراق میں پالیسی خطے میں جمہوریت لانے کے لیے ہے اور انہیں یقین ہے کہ مشرقِ وسطیٰ عراق جنگ کے بعد کم جمہوری ہو گیا ہے اور یہ کہ عراقی عوام کی حالت جنگ سے پہلے کی نسبت اب زیادہ خراب ہے۔ امریکہ کی مجموعی طور پر پسندیدگی کی شرح اتنی کم تھی کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مصر میں 2 فی صد، سعودی عرب میں 4 فی صد، مراکش میں 11 فی صد، متحدہ عرب امارات میں 14 فی صد، اُردن میں 15 فی صد اور صرف لبنان میں شرح اونچی تھی یعنی 20 فی صد۔

یہ وہ عرب ملک تھے جن کے امریکہ کے ساتھ قریب ترین تاریخی روابط تھے۔ سروے میں جواب دینے والے تین چوتھائی سے زیادہ لوگوں نے حکومت کے جمہوری اصولوں کی تائید کی لیکن انہوں نے عراق پر حملے اور فلسطینیوں کے حقوق کے

Marfat.com

خلاف امریکہ کے ظاہری تعصب کی بھرپور مذمت کی۔ ہماری قابلِ تعریف جمہوری کوششوں کے باوجود یہ خطے میں ہماری پالیسیوں کے لیے نیک شگون نہیں ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بنیاد پرستوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختلافات کو دور کرنے کے لیے مذاکرات یا گفتگو کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ وہ اسے اپنے اصولوں پر کاربند رہنے میں کمزوری کی علامت تصور کرتے ہیں۔ ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس کے درمیان سب سے بڑا فرق متنازعہ بین الاقوامی معاملات کو حل کرنے کے طریقوں کو ترجیح دینے کا ہے..........طاقت پر انحصار یا سفارت کاری۔

ہماری قوم ہمیں درپیش بین الاقوامی چیلنجوں کا بنیادی جواب دینے کے معاملے پر واضح طور پر تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ بات تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ امریکی سرزمین کبھی مکمل طور پر محفوظ نہیں ہوگی۔ امریکہ کو ایسی نسبتاً کمزور تنظیموں کی طرف سے دہشت گردی کا خطرہ رہے گا جو امریکہ کی بے پناہ فوجی قوت کے کسی بھی پہلو کو چیلنج کرنے کی امید نہیں کر سکتیں۔

ہمارا بہترین جواب کیا ہے؟ کیا اپنا انسانی حقوق کے چیمپئن کا تاریخی کردار ادا کرنا ہمارے لیے بہتر ہے یا خطروں کا جواب دینے کے لیے اپنے اعلیٰ ملکی اور بین الاقوامی معیارات کو ترک کر دینا؟ کیا یہ بہتر ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں پر انحصار نہ کرنے اور ان کے مزید پھیلاؤ کو روکنے کی مثال قائم کی جائے یا یہ بہتر ہے کہ ہم اپنے ایٹمی اسلحہ خانے کو برقرار رکھنے، اسے توسیع دینے کے اپنے (اور دوسروں کے) حق پر اصرار کریں؟ کیا ایٹمی اسلحہ خانہ برقرار رکھ کر اور اسے توسیع دے کر کئی دہائیوں سے زیرِ بحث چلے آ رہے ایٹمی اسلحے پر کنٹرول کے معاہدوں کو توڑنا بہتر ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم اس وقت تک امن کو اپنی قومی ترجیح سمجھیں جب تک کہ ہماری سلامتی کو براہِ راست خطرہ لاحق نہ ہو یا کیا ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم کسی ڈکٹیٹر کو اقتدار سے ہٹانے اور دوسرے مقاصد کے حصول کے لیے دوسرے ملکوں پر یک طرفہ حملہ کرنے کو اپنا ناقابلِ تنسیخ حق سمجھتے رہیں؟ کیا دو طرفہ مفادات کی واضح تفہیم کی اساس پر اتحاد تشکیل دینے سے زیادہ بہتر یہ اعلان ہے کہ ''یا تو تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے مخالف

Marfat.com

ہو؟'' جب دوسرے ملکوں کے ساتھ سنجیدہ اختلافات پیدا ہو جائیں تو مسئلے حل کرنے کے لیے ان کے ساتھ مذاکرات کرنا بہتر ہے یا اختلاف کرنے والوں کو بین الاقوامی اچھوت قرار دینا............اور مذاکرات کی تجویز کو رد کر دینا؟

ان میں سے بیشتر سوالوں کے جواب ہماری حکومت کی پالیسیاں پہلے ہی دے چکی ہیں............وہ پالیسیاں جنہیں بنیاد پرستی کی اساس پر تشکیل دیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہے کہ امریکی عوام انہیں منظور کرتے ہیں یا نہیں۔

Marfat.com

پندرھواں باب

امریکہ کی ماحولیات دشمنی

گذشتہ 150 سال سے امریکہ کی دونوں سیاسی جماعتوں کا متفقہ عہد یہ رہا ہے کہ ماحول کو بہتر بنایا جائے اور اس کا تحفظ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے نیشنل پارکوں اور جنگلی علاقوں (Wilderness Arears) کو محفوظ کیا ہے، انہیں توسیع دی ہے اور نئے پارک اور جنگلی علاقے قائم کیے ہیں، ہوا اور پانی کی صفائی کو یقینی بنانے کے لیے نئے قانون بنائے ہیں اور انہیں مزید مضبوط کیا ہے اور سارے ملکوں کے شہریوں کو ماحولیاتی آلودگی اور زہریلے مادوں سے محفوظ رکھنے کی کوششیں کی ہیں۔ امریکہ کا پہلا نیشنل پارک ''ییلو سٹون'' (Yellowstone) یولیسیس ایس گرانٹ (Ulysses S. Grant) کے دور میں بنایا گیا تھا۔ تھیوڈور روز ویلٹ اور ان کے بعد منتخب ہونے والے صدور نے اس نظام کو مزید وسیع کیا اور رچرڈ نکسن نے ہوا اور پانی کی صفائی کے لیے قانون بنایا۔ جب الاسکا کو ریاست بنایا گیا تو صدر ڈوائٹ آئزن ہاور کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ زمین کے وسیع ٹکڑے ایسے ہیں جنہیں ریاست اور وفاقی حکومت، اسکیموؤں (Eskimos) اور دوسری مقامی امریکیوں (Native Americans)، اور بعض نجی اداروں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہے۔ ایوانِ نمائندگان نے ایک قانون بنایا کہ الاسکا کے شمالی ساحل پر 90 لاکھ ایکڑ اراضی کو کبھی کاروباری اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ جب الاسکا کے دو سینیٹروں نے سینیٹ کی طرف سے اس قانون کی منظوری میں رکاوٹ ڈالی تو صدر آئزن ہاور نے ''منفرد جنگلی حیات، جنگل اور تفریحی اقدار کے تحفظ کے مقصد'' کے تحت آرکٹک نیشنل وائلڈ لائف

Marfat.com

یہ تھی وہ صورتِ حال جو آج سے اکیس سال پہلے مجھے ورثے میں ملی تھی۔ زمین کی تقسیم سے متعلق پیچیدہ اور متنازعہ مسئلوں کو حل کرنے میں میری حکومت اور کانگرس کے دو جماعتی اتحاد کو پورے چار سال لگ گئے لیکن آخر ہم نے الاسکا نیشنل انٹریسٹ لینڈز کنزرویشن ایکٹ (Alaska National Interest Lands Conservation Act-ANILAC) منظور کر لیا، جس کے تحت تمام اراضی کو تقسیم کر دیا گیا۔ اس سے ہم اپنے نیشنل پارک سسٹم کو دگنا اور ہمارے جنگلی علاقوں کو تین گنا کرنے کے قابل ہو گئے۔

ایوان نے آئزن ہاور ایریا کو .... بشمول موجودہ آرکٹک نیشنل وائلڈ لائف رینج کے .... محفوظ رکھنے کی میری ترجیحی تجویز کے ساتھ ایک بل پاس کیا لیکن آخری منٹ میں الاسکا کے سینیٹروں کی مخالفت کی وجہ سے اسے جنگل کا پورا درجہ نہ دیا جاسکا۔ الاسکا کے سینیٹر تیل کی صنعت کے بہت زیادہ زیرِ اثر تھے۔ ہم یہ تقاضا شامل کروانے میں کامیاب ہو گئے کہ اگر کبھی اس علاقے کو آئل ڈرلنگ (Oil Drilling) کے لیے کھولا گیا تو کانگرس ایک بالکل نیا ایکٹ منظور کرے گی۔ ہمارا مفروضہ یہ تھا کہ اس طرح کانگرس کے دونوں ایوان اور کوئی بھی صدر اس علاقے کے غلط استعمال سے متفق نہیں ہوں گے۔

اس توقع کا ادراک اگلے 25 برسوں میں ہونا تھا، جس کی اساس دو بنیادی معیار تھے: اول، یہ علاقہ متنوع اور عالمی درجے کی (ورلڈ کلاس) جنگلی حیات کا رہائشی علاقہ ہے اور یہاں موجود جنگل بہت قیمتی ہے۔ ہم نے عین انہی وجوہات کے تحت ییلوسٹون (Yellostone) اور یوسیمائٹ (Yosemite) کو محفوظ کیا ہے۔ دوم، روشن خیال (Enlightened) امریکی سیاسی لیڈروں کو علم ہے کہ ہمارے ملک کے توانائی کے مستقبل (Energy Future) کا انحصار قیمتی فطری ماحول کی تباہی پر نہیں بلکہ بہت کم خرچ والے متبادلوں پر ہے، جو ہمیں غیر ملکی تیل سے زیادہ یقینی اور مستقل آزادی عطا کر دیں گے۔

یہ قیمتی علاقہ اُس محفوظ علاقے کا ماحولیاتی دل (Ecological Heart)

Marfat.com

ہے، جو کینیڈا کے شمال مغربی گوشے میں واقع محفوظ جنگلی حیات کے رہائشی اضافی لاکھوں ایکڑ رقبے سے جڑا ہوا ہے۔ اس جنگلی گھر میں نہایت خوبصورت جنگلی حیات نشو ونما پا رہی ہے، جسے شمالی امریکی سیرنگیٹی کہا جاتا ہے۔ اس سے ہمارے عوام میں اپنے فطری ورثے کی بے پناہ محبت پیدا ہوئی ہے۔ میری اور روزالن کی خوش قسمتی ہے کہ ہم اس علاقے کی سیر کر چکے ہیں۔ وہ منظر ہم کبھی نہیں بھلا سکتے جب ہم دونوں زمین پر جھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہمارے قریب سے بے شمار خوبصورت جانور دوڑتے ہوئے گذر رہے تھے۔ وہ بچے جننے اور پالنے کے لیے اپنے مخصوص علاقے کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ اب عین اسی علاقے میں تیل کی تلاش شروع کی جا رہی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مشکی بیلوں (Musk Oxen) کے ایک ریوڑ نے اپنے بچوں کو حفاظت کے لیے گھیرے میں لیا ہوا ہے.......... تاہم ہم جانتے تھے کہ ان کا دفاعی رویہ انہیں صنعتی ترقی کی لپیٹ میں آنے سے نہیں بچا سکے گا۔ یہی معاملہ قطبی ریچھ اور لاکھوں ہجرتی آبی پرندوں کا ہے، جو اس ساحلی میدان میں آ کر رہتے ہیں۔ یہ ان کا جنگلی گھر ہے۔

آخر مارچ 2005ء میں تیل کی صنعت کامیاب ہو ہی گئی۔ وائٹ ہاؤس اور کانگرس کے دونوں ایوانوں پر صرف ایک پارٹی کا کنٹرول ہے اور ایک بجٹ بل میں یہ تباہ کن شق شامل کروا دی گئی جو اس محفوظ علاقے کو بچانے کی کوشش کرنے والے سینیٹروں کی مخالفت کے سامنے دیوار بن گئی۔ اگرچہ یہ قانون بالآخر منظور کر لیا گیا ہے تاہم اب بھی کچھ امید ہے کہ ذمہ دار تیل کمپنیاں ڈرلنگ کے ذریعے امریکی عوام سے دغا نہیں کریں گی۔ پٹرولیم پروڈکٹس کے ایک صارف کی حیثیت سے میں ان علاقوں میں ڈرلنگ کرنے والی تیل کمپنیوں کی مصنوعات کو اس وقت خریدوں گا جب کسی اور کمپنی کی مصنوعات دستیاب نہیں ہوں گی اور ہو سکتا ہے ایسا ہی سوچنے والے لاکھوں دوسرے ماحول دوست لوگ بھی موجود ہوں۔

ہمارا ملک سات ارب بیرل تیل ہر سال استعمال کرتا ہے۔ اگر محفوظ علاقے سے 10 لاکھ بیرل تیل روزانہ نکالے جانے کی توقع پوری ہو بھی گئی تو اس سے تیل کی ملکی رسد میں معمولی سا ہی اضافہ ہوگا اور غیر ملکی تیل پر ہمارے انحصار میں کوئی خاص کمی

Marfat.com

سے 10 لاکھ بیرل تیل روزانہ نکالے جانے کی توقع پوری ہو بھی گئی تو اس سے تیل کی ملکی رسد میں معمولی سا ہی اضافہ ہوگا اور غیر ملکی تیل پر ہمارے انحصار میں کوئی خاص کمی نہیں آئے گی۔ توانائی کے ماہرین کے بقول اس محفوظ علاقے سے امریکہ کی صرف سال بھر کی ضروریات کے برابر تیل حاصل ہوسکتا ہے۔

غیر ملکی تیل پر انحصار کو کم سے کم کرنا ایک قابلِ قدر مقصد ہے، تاہم اس مقصد کے حصول کے مستقل اور بہت زیادہ مؤثر دوسرے طریقے بھی ہیں۔ جب میں صدر بنا تو امریکی گاڑیوں کی اوسط کارکردگی صرف بارہ میل فی گیلن تھی۔ میں نے امریکی گاڑیاں بنانے والوں اور کانگرس کے ساتھ مل کر اس کارکردگی میں اضافے کے اپنے وعدے کو پورا کرنے کی کوششیں کیں۔ میں نے یہ اوسط 27.5 میل فی گیلن تک بڑھوا دی۔ جب سے میں نے عہدہ چھوڑا ہے اس اوسط کارکردگی میں کمی آ رہی ہے جس کے لیے بڑی چالاکی سے راستے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اب موٹر گاڑیاں ہمارے ملکی تیل کا چالیس فی صد استعمال کر رہی ہیں جبکہ ٹرکوں اور ایس یو ویز (SUVs) کی اوسط انجن ہارس پاور 1980ء سے دگنی ہو چکی ہے۔ جبکہ ان کے وزن میں تقریباً 1000 پونڈ کا اضافہ ہوا ہے۔ بڑی ایس یو ویز (SUVs) اور ہمر (Hummers) جن کا وزن دُگنا ہوتا ہے، کارکردگی کے ان ضابطوں سے مستثنیٰ ہیں۔

الاسکا محفوظ علاقے کو بے دردی سے تباہ کرنے کے فیصلے کا المیہ ہے کہ جب آج سے 15 سے 20 سال بعد اس علاقے سے تیل کی پیداوار عروج کو پہنچے گی، تب اس کی مقدار اُس مقدار کے برابر ہو گی جتنی کہ ''ہلکے ٹرکوں'' (SUVs) کی مطلوبہ کارکردگی، یعنی عام کاروں کے مساوی 20 میل فی گیلن، کے ذریعے بچائی جا سکتی ہے۔ 1980ء میں ہمارے طے کردہ ہدف تک پہنچنے کی صورت میں کہیں زیادہ بچت کی جا سکتی ہے۔ یہ اَمر باعثِ حیرت شاید نہیں ہے کہ اس معاملے میں تیل کی صنعت اور گاڑیاں بنانے والے بہت زیادہ سیاسی دباؤ استعمال کر رہے ہیں جبکہ گیس گزلرز (Gas Guzzlers) ہمارے ملک کی ایک بڑی پروڈکٹ بن چکے ہیں۔ ایندھن کی معیشت کے خلاف حکومت کا یہ احمقانہ فیصلہ مستقبل میں امریکہ کی آٹو موبائل انڈسٹری

Marfat.com

گاڑیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ہمارے ملک کی ایک افسوس ناک ضرورت ہمارے نیشنل پارکوں کی معمول کی دیکھ بھال ہے۔ چونکہ الاسکا لینڈز بل آج سے ربع صدی پہلے منظور کیا گیا تھا اس لیے کانگرس نے 80 سے زیادہ پارکوں کو سسٹم میں شامل کر دیا تھا، اس طرح کل پارک 388 ہو جاتے، تاہم نہ تو صدر اور نہ ہی کانگرس کے ارکین نے ان کی دیکھ بھال کے لیے کافی رقوم مختص کیں۔ گورنر جارج ڈبلیو بش نے اپنی 2000ء کی صدارتی مہم کے دوران اسے اپنے ماحولیاتی ایجنڈے کا مرکزی اِیشو بنایا تھا۔ انہوں نے سابقہ صدر پر شدید تنقید کی تھی کہ انہوں نے پارکوں کو زوال کا شکار ہونے سے نہیں بچایا۔ انہوں نے پانچ سال کے دوران پارکوں کی دیکھ بھال پر ایک اَرب ڈالر سالانہ خرچ کرنے کا وعدہ کیا۔ یاد رہے اُس زمانے میں کل خرچ کا تخمینہ 19.9 اَرب ڈالر لگایا گیا تھا۔ اس میں سے صرف 18 فی صد رقم خرچ کی گئی اور 2005ء میں کانگرس کی غیر جماعتی ریسرچ سروس نے تخمینہ لگایا کہ اب 17.5 اَرب ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے۔ بلاشبہ یہ ناکامی دونوں جماعتوں کی ہے۔

1980ء میں اپنی لاک (ANILAC) کی منظوری کے ساتھ ہی ''سپر فنڈ'' کے نام سے معروف قانون بھی منظور کر لیا گیا۔ میں بعض غیر ذمہ دار کارپوریشنوں کی طرف سے زہریلے مادّوں کے اخراج کے حوالے سے طویل عرصے سے فکر مند تھا۔ میں نے کانگرس کے دونوں جماعتوں کے اراکین کے ساتھ مل کر یہ قانون بنوایا کہ ایسے زہریلے مادوں کے اخراج میں کمی کی جائے۔ اس کے علاوہ ہم نے ذمہ دار کارپوریشنوں سے ان کے پھینکے ہوئے زہریلے مادوں کی صفائی کا خرچ وصول کرنے کا قانون بھی بنوایا۔ اس کے علاوہ آلودگی پھیلانے والی کیمیائی کمپنیوں پر ایک چھوٹا سرچارج لگوایا جو کہ مستقبل کی ضروریات پوری کرنے والا ایک مستقل فنڈ تھا۔ اب واشنگٹن میں نئی حکومت کے قیام کے بعد صنعتی لابی ایک بار پھر حاوی ہو گئی ہے اور ''آلودگی پھیلانے والے ہرجانہ ادا کریں گے'' والا اصول متروک قرار دے دیا گیا ہے۔ 2004ء میں امریکی ٹیکس دہندگان کو آلودگی ختم کرنے کے اخراجات کا تقریباً

Marfat.com

80فی صد ادا کرنا پڑا اور 2005ء میں انہیں پورے اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے۔ غیر ذمہ دار کارپوریشنوں کو زہریلے مادے بے احتیاطی سے ٹھکانے لگانے پر معمولی ہرجانے عائد کیے گئے ہیں۔

امریکہ کے چوٹی کے لیڈروں نے اس سال ایک انتہائی متنازعہ فیصلہ کیا ہے جس کے تحت انہوں نے گرین ہاؤس گیسوں کو، جو کہ ہمارے سیارے کا درجۂ حرارت بڑھانے کا باعث ہیں، کنٹرول کرنے کے بین الاقوامی معاہدے میں شمولیت سے انکار کر دیا ہے۔ تمام اقوامِ عالم اور امریکی ماحول دوستوں نے اس فیصلے کی مذمت کی۔ یہ بات اَب تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ انسانوں کی بنائی ہوئی گیسیں، خصوصاً آکسائیڈز، فضا میں بلند ہو کر ویسا ہی کمبل بنا دیتی ہیں جیسا کہ گرین ہاؤس کے گرد پلاسٹک یا شیشے سے بنایا گیا ہوتا ہے۔ سورج کی شعاعیں زمین پر گرمی پھیلاتی رہتی ہیں لیکن یہ گرمی زمین کی فضا سے خارج ہو جانے کی بجائے فضا ہی میں رہ جاتی ہے۔ اس طرح زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں اس مسئلے پر اس وقت پہلی بار سنجیدگی سے غور کیا گیا تھا جب میں صدر تھا۔ اس زمانے میں نیشنل اوشیانک اینڈ ایٹوموسفیرک ایڈمنسٹریشن (National Oceanic And Atmospheric Administration) اور نیشنل اکیڈمی آف سائنسز (National Academy of Sciences) کے سائنس دانوں نے فضا میں اکٹھی ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے منفی اثرات کے حوالے سے تشویش کا اظہار کرنا شروع کیا تھا۔ یہ مسئلہ اتنا سنگین تھا کہ میرے سائنس کے مشیر ڈاکٹر فرینک پریس نے نیشنل اکیڈمی کو اس معاملے کا جائزہ لینے کا کہا اور 1979ء کے موسمِ گرما میں میا چوسیٹس کے ووڈز ہول ریسرچ سینٹر (Woods Hole Research Center) میں ممتاز سائنس دانوں کی کانفرنس منعقد کی گئی۔ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ جب کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دگنی ہو جائے گی تو ہمارے سیارے کا درجۂ حرارت 5 درجے فارن ہائیٹ بڑھ جائے گا۔ مجھے پیش کی گئی سرکاری رپورٹ میں اضافہ کیا گیا تھا، ''ہم نے بہت کوشش کی لیکن درجۂ حرارت کم کرنے کا

Marfat.com

کوئی طریقہ نہیں ڈھونڈ سکے۔''

سائنس دانوں کا انتباہ سچ ثابت ہو رہا ہے۔ اب پہاڑوں کے گلیشیئر اور قطبی علاقوں کی بَرف بڑی مقدار میں پگھل رہی ہے، سمندروں کی سطح میں اضافہ ہو رہا ہے اور حساس انواع کے رویے اور زندہ رہنے کی صلاحیت میں نمایاں بے قاعدگیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ سب بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور توقع ہے کہ 2030ء تک گلیشیئر نیشنل پارک کی ساری برف پگھل جائے گی۔ روزالن اور میں حال ہی میں الاسکا میں اینی لاک(ANILAC) کی پچیسویں سال گرہ منا کر آئے ہیں۔ وہاں کے اخباروں نے شہ سرخیوں کے ساتھ خبریں شائع کیں کہ قطبی ریچھ کی نوع کے فنا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس کے علاوہ بَرف کی چادروں کی عدم موجودگی اور سمندر کی سطح اونچی ہو جانے کی وجہ سے اسکیمو بستیوں کے غرقاب ہو جانے کے حوالے سے مضامین شائع کیے گئے۔ ہم نے کینائی فجورڈز کے علاقے میں ایک گلیشیر کا دورہ کیا جو کہ تیزی سے پگھل رہا ہے۔

صدر جارج ایچ۔ ڈبلیو بش اور صدر بل کلنٹن نے کیوٹو پروٹوکول کے لیے مذاکرات میں مدد دی تھی۔ کیوٹو پروٹوکول ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے اور گلوبل وارمنگ (Global Warming) کو بڑھانے والی گیسوں کے اکٹھا ہونے میں کمی لانے کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کوشش کی تاریخ ہمارے ملک کی اقدار میں حالیہ تبدیلی کی ایک اور علامت ہے۔ 1988ء تک بین الاقوامی برادری اس مسئلے کے حوالے سے گہری تشویش کا شکار ہو چکی تھی اور آب و ہوا کی تبدیلی کے حوالے سے ایک بین الاقوامی پینل تشکیل دیا جا چکا تھا۔ دو سال کے گہرے سائنسی جائزے کے بعد ایک رپورٹ جاری کی گئی، جس میں کہا گیا تھا کہ کرۂ ارض کا درجۂ حرارت بڑھ رہا ہے اور انسانی سرگرمیاں اس کا باعث ہیں۔

1992ء میں دنیا کی تاریخ کا عالمی لیڈروں کا سب سے بڑا گروپ ریوڈی جنیرو، برازیل میں اکٹھا ہوا۔ اسے ''ارتھ سمٹ'' (Earth Summit) کا نام دیا گیا۔ صدر جارج ایچ۔ ڈبلیو بش اور دوسرے لیڈروں نے دنیا سے 2000ء تک گرین ہاؤس گیسوں بالخصوص کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کو 1990ء والی سطح تک

Marfat.com

لانے کا مطالبہ کیا۔ اقوامِ متحدہ اور دیگر ملکوں نے اس کنونش کی توثیق کی اور اس میں شریک ملکوں کو قانوناً پابند کیا گیا کہ وہ اس معاہدے کے مطابق عمل کریں گے۔ صدر بش کی کوششوں سے ترقی پذیر ملکوں کو اس پابندی سے استثناد دیا گیا کیونکہ صنعتی ملک زہریلی گیسوں کے اخراج کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ اس اَمر پر بھی اتفاق کیا گیا کہ معاہدے کے شرکاء ہر سال اجلاس منعقد کریں گے جس میں گلوبل وارمنگ کی وجوہات اور سنگینی کے حوالے سے سائنسی معلومات پر غور کیا جائے گا۔

پانچ سال کے مزید مطالعے کے بعد ایک دوسری رپورٹ جاری کی گئی جس میں تصدیق کی گئی کہ ''عالمی درجۂ حرارت پر انسانی اثرات'' پڑ رہے ہیں۔ اس رپورٹ میں مزید کہا گیا تھا کہ ''موسمی تبدیلی نوعِ انسان کے لیے ایک خطرہ ہے۔'' اس سنجیدہ تحقیق کے بعد 1997ء میں کیوٹو، جاپان میں ایک بین الاقوامی اجلاس منعقد کیا گیا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ 2008ء سے 2012ء کے درمیانی عرصے میں گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں 1990ء کی سطح سے مجموعی طور پر 5 فی صد کی کمی لائی جائے گی۔ اس پروٹوکول پر دستخط کرنے والے ہر ملک نے رضاکارانہ طور پر کمی کا وعدہ کیا۔ جرمنی نے 25 فی صد، برطانیہ نے 15 فی صد، اور امریکہ نے شرمناک حد تک تھوڑی یعنی 7 فی صد کمی کا وعدہ کیا۔

قومی لیڈر اس مسئلے پر اپنا مطالعہ اور مذاکرات جاری رکھے ہوئے تھے لیکن صدر جارج ڈبلیو بش نے اپنے انتخاب کے فوری بعد اعلان کیا کہ کیوٹو معاہدے کے مطابق گرین ہاؤس گیسوں میں تھوڑے عرصے میں لازماً کمی لانا بہت مہنگا پڑے گا۔ یہ عمل اس صورت میں غیر دانشمندانہ ہوگا کہ امریکہ کو توانائی کے بحران کا سامنا ہے۔ تاہم انہوں نے بون، جرمنی میں بین الاقوامی کانفرنس کروانے میں عالمی لیڈروں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے اتفاق کیا۔ اس کانفرنس میں عالمی طاقتوں نے 29 جولائی 2001ء کو صبح سویرے ایک تاریخی معاہدہ کیا۔ تاہم نئے امریکی لیڈر نے ہمارے ملک کے سارے سابقہ وعدوں سے انکار پر ہی زور دیا۔ 180 ملکوں نے (یعنی امریکہ اور ایک اور ملک کے علاوہ ساری دنیا نے) کیوٹو پروٹوکول کے اطلاق سے اتفاق کیا۔

Marfat.com

امریکی مخالفت کے باوجود یہ شرط منظور کر لی گئی کہ جب مجموعی طور پر 55 فی صد گلوبل گرین ہاؤس اخراج کے ذمہ دار ملک اسے تسلیم کرلیں گے، تب یہ مؤثر ہوگا۔ تاریخی مرحلہ وہ تھا جب روس نے اس معاہدے کی توثیق کردی، اور 90 دن بعد 16 فروری 2005ء کو کیوٹو پروٹوکول بین الاقوامی قانون بن گیا۔

اپریل 2005ء میں رسالے ''سائنس'' میں ایک رپورٹ شائع ہوئی۔ سائنس دانوں کا ایک گروپ اس رپورٹ کا مرتب تھا، جس کے سربراہ ناسا (NASA) کے ماہر موسمیات جیمز ای ہینسن تھے، تاکہ موسمی تبدیلیوں سے متعلق پیش گوئیاں یقینی سمجھی جائیں۔ پانچ سال تک دنیا بھر میں موجودہ دو ہزار سے زیادہ مانیٹرنگ سٹیشنوں کی مدد سے تحقیق کرنے کے بعد انہوں نے نتیجہ نکالا کہ اگر گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو فوری طور پر بند بھی کر دیا گیا تو درجۂ حرارت بڑھتا رہے گا اور اگر اصلاحی اقدامات نہ کیے گئے تو ''قابو سے باہر'' ہو جائے گا۔ اس صدی میں دس درجے فارن ہائیٹ کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس مسئلے کے حوالے سے مزید سائنسی شواہد کی روشنی میں ہالینڈ نے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں 80 فی صد، برطانیہ نے 60 فی صد اور جرمنی نے اگلے پانچ سال میں 50 فی صد کمی کا عہد کیا ہے۔

گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج پر پابندی نہ لگانے سے ہمارے حکومتی لیڈروں نے امریکہ کو دنیا بھر کے لوگوں کی مذمت کا ہدف بنا دیا ہے۔ لوگ امریکہ کی طرف سے ماحولیاتی معیاروں کو ردّ کرنے پر اس کو ملامت کر رہے ہیں۔ برطانیہ کے ایک اہم سائنس دان اور رائل سوسائٹی کے صدر رابرٹ ہے نے کہا، صدر بش ''سائنسی صداقت'' کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ''جی۔ ایٹ پر ایک بنیاد پرستانہ آئیڈیالوجی تھوپنے'' کی کوشش کر رہے ہیں۔

امریکہ اپنے ماحول سے بھی ایسی ہی بے احتیاطی اور لاپروائی برت رہا ہے۔ صاف ہوا اور پانی، کان کنی، جنگلات، زہریلے مادوں اور فنا کے خطرے سے دوچار انواع کے تحفظ کے لیے قانون موجود ہے، جس کی باقاعدگی سے تجدید کی جاتی ہے، ساتھ ہی توقع کی جاتی ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تر معیارات کا

Marfat.com

اطلاق کیا جائے گا۔ چونکہ کانگرس کی کلیدی کمیٹیوں پر ماحولیات دوستی کے مخالف ری پبلکنوں کا غلبہ ہے، اس لیے تمام متعلقہ قوانین طویل عرصے سے تجدید کے منتظر ہیں جبکہ وائٹ ہاؤس یا کسی اور ذریعے کی جانب سے ان معاملات پر غور کرنے کا کوئی عندیہ نہیں ملتا۔

موجودہ حکومت نے معیارات کو بڑھانے کی بجائے کوئلے سے بجلی پیدا کرنے والے پُرانے پلانٹس کو آلودگی کنٹرول کرنے والے آلات نصب نہ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس سے 2015ء یا اس کے بعد تک راکھ سے شہریوں کی صحت کو خطرات لاحق رہیں گے جبکہ فضا میں سلفر ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دگنا اور نائٹروجن آکسائیڈ کی مقدار ڈیڑھ گنا ہو جائے گی۔ ہوا کو آلودہ کرنے والوں کو اس پر قابو پانے کے لیے دس سال چھوٹ دینے کی تجویز ری پبلکنوں نے کانگرس میں پیش کی ہے۔ یہ چھوٹ اس وقت تک رہے گی جب تک کہ متاثرین اپنی ہوا کو خود صاف کرنے کا بندوبست نہیں کر لیتے۔ آلودگی پھیلانے والی صنعتیں اس قانون کی بھرپور حمایت کر رہی ہیں جبکہ اس قانون کی منظوری سے الزامات کا ایک اور کھیل شروع ہو جائے اور کلین ایئر ایکٹ کو ایک اور سنگین دھچکا لگے گا۔

گزشتہ چار برسوں میں ماحول کو صاف رکھنے کے لیے ضروری عوامل کو ردّ کرنے کا ایک مخصوص پیٹرن رہا ہے۔ یوں تو بعض بڑے معاملات پر دونوں پارٹیوں میں مضبوط اختلافات رہے ہیں اور بھرپور بحثیں ہوئی ہیں لیکن ہمارے ماحول کی بہتری کے حوالے سے ایسا نہیں ہوا۔ بعض ممتاز ری پبلکنز گلوبل وارمنگ اور دوسرے مسائل کی جانب سے اپنی پارٹی کے لیڈروں کی بے فکری اور لاپروائی پر تشویش کا شکار ہیں۔ جب سینیٹر جان میکین سے صدر اور ان کے کانگرس کے بعض ساتھیوں کی پالیسیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا، ''اس وقت اقدام نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، تاہم ہمیں مستقبل میں حکومت کو قائل کرنے کا مشکل مرحلہ درپیش ہے۔ موسمی تبدیلی کے حوالے سے وائٹ ہاؤس کا رویہ مایوس کن ہے۔ بدقسمتی سے واشنگٹن ڈی سی پر مخصوص مفادات کی حکمرانی ہے۔ بڑی لابیوں نے کیپٹل ہل میں بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل

Marfat.com

کرلیا ہے۔'' انہوں نے مزید کہا، '' کیا ہم اپنے بچوں کو اس سے بہت مختلف دنیا دیں گے، جس میں ہم رہ رہے ہیں؟'' جون 2005ء میں ری پبلکنوں کی قیادت میں امریکی سینیٹ نے وائٹ ہاؤس کی شدید مخالفت کے باوجود عالمی درجۂ حرارت بڑھانے والی گیسوں کے اخراج پر پابندی کی قرارداد کو منظور کرلیا۔

ہماری آٹوموبائیل انڈسٹری کی طرح وہ صنعتیں، جو توانائی اور ماحولیاتی آلات کی پروڈکشن سے متعلق ہیں، عالمی درجۂ حرارت کو نہ بڑھنے دینے والے اقدامات سے گریز کریں گی تو انہیں عالمی منڈی میں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ درحقیقت جنرل الیکٹرانکس اور دوسری کمپنیوں نے کیوٹو معاہدے کی شقوں پر عمل درآمد کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ امریکی حکومت کی مخالفت کے باوجود صاف ٹیکنالوجی (Clean Technology) مستقبل کی لہر ہے۔

رائے عامہ کے سروے عیاں کرتے ہیں کہ امریکی عوام ان قوانین کی زبردست حمایت کرتے ہیں جن کا تعلق ہوا اور پانی کے معیار کو محفوظ رکھنے سے، آلودگی کنٹرول کرنے سے، جنگلی حیات کے تحفظ سے اور پارکوں میں توسیع اور ان کے تحفظ سے ہے۔ لوگوں نے ان کاموں کے لیے مطلوب رقوم کے حصول کے لیے ٹیکس میں خصوصی اضافے کو بھی قبول کرنے کا واشگاف اظہار کیا۔ گذشتہ دس برسوں کے دوران 43 امریکی ریاستوں میں ہونے والے ریفرنڈموں میں ماحول کے تحفظ کی 1376 میں سے 1065 قانونی شقوں کو عوامی منظوری دی جاچکی ہے۔

ہمیں اپنی حکومت کی نئی پالیسیوں کے جیوپولیٹیکل (Geopolitical) نتائج بھگتنا ہوں گے، کیونکہ ہماری حکومت نے تیل کی دولت سے مالا مال غیر جمہوری ملکوں کو نوازنا اور ان پر اپنا انحصار جاری رکھا ہوا ہے۔ اِدھر ہم نے اپنے کارخانوں اور آٹوموبائیل انڈسٹری کو گرین ہاؤس ایفیکٹ کو گھٹانے کا پابند نہیں کیا۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو ہمیں چین اور دوسرے ملکوں سے ناگزیر سیاسی اور معاشی مقابلہ کرنا پڑے گا کیونکہ انہیں اپنی تیز رفتار ترقی کے لیے انہی ذرائع سے تیل کی ضرورت ہے جن سے امریکہ تیل حاصل کررہا ہے۔ اس وقت دنیا میں 80 کروڑ گاڑیاں چل رہی ہیں اور

Marfat.com

اندازہ لگایا گیا ہے کہ چین اور ہندوستان کی معاشی ترقی کی وجہ سے یہ تعداد ہر سال بڑھے گی اور اگلے 40 برسوں میں کاروں کی تعداد 3.25 اَرب ہو جائے گی۔ اس اضافے سے کرۂ ارض کے ماحول پر پڑنے والے اثرات کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس صورتِ حال کا اس وقت بہترین جواب یہی ہے کہ پاور پلانٹس او رگاڑیوں میں کم ایندھن استعمال کر کے ان سے زیادہ کام لیا جائے۔ اس کے علاوہ الیکٹرک پاور پلانٹس کے لیے توانائی کے دوسرے ذرائع استعمال کیے جائیں۔ ایٹمی ایندھن ایک بہترین لیکن محدود متبادل ہے۔ اس وقت امریکہ کی 20 فی صد بجلی 103 ایٹمی ری ایکٹروں سے حاصل کی جارہی ہے اور اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی سے ایٹمی ری ایکٹروں کا تحفظ بہت زیادہ بہتر ہو چکا ہے اور ایٹمی فاضل مادوں میں بھی کمی لائی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں مَیں نے اس تقریب میں شرکت کی جس میں ایک آبدوز کو میرا نام دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ پہلی ایٹمی بحری جہاز بنوانے میں میری مدد کے 50 سال بعد ہوا ہے۔ اس زمانے میں ری ایکٹر کی کوروں (Cores) کو تین سال کے اندر تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ تاہم نئی آبدوز کے فیول راڈز (Fuel Rods) کم ازکم 35 سال تک کام دیں گی یا اس آب دوز کی زندگی پوری ہونے تک۔

اس وقت امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ ماحولیاتی آلودگی پھیلانے والا ملک ہے۔ ہماری حکومت کی طرف سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے انکار عالمی ماحول کے تحفظ کے دو جماعتی تاریخی وعدوں سے انحراف کے سلسلے کی محض ایک اور المناک کڑی ہے۔ خداوند کی دنیا کا تحفظ ہماری ایک ذاتی اور سیاسی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

Marfat.com

سولھواں باب

نئی ہزاری میں دنیا کا سب سے بڑا چیلنج

مذہب کا ایک اہم ترین تقاضا، جسے بنیاد پرست اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ جم ویلیس نے، جو کہ رسالے ''سوجورنرز'' (SoJourners) کے مدیر ہیں، رپورٹ دی ہے کہ انہوں نے سیمینیری کے دوسرے طالبِ علموں کے ایک گروپ کے ساتھ مل کر دولت اور غربت سے متعلق بائبل کی عبارتوں کو تلاش کیا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ عہد نامۂ جدید کی سولہ میں سے ایک، گوسپلز (Gospels) کی دس میں سے ایک اور لوقا کی گوسپل کی سات میں سے ایک عبارت میں دولت یا غریبوں کا ذکر ہے۔ عبرانی صحیفوں کی جن عبارتوں میں دولت مندوں اور غریبوں کے تعلق کا ذکر ہے، ان سے تعداد میں صرف ایسی عبارتیں زیادہ ہیں جن میں شرک کا تذکرہ ہے۔

لارڈز پریئرز (Lord's Prayers) اور خداوند کی بادشاہت کے زمین پر قائم ہونے کی دعا میں ہم سے کہا گیا ہے کہ دنیاوی حکومتوں کی سیاسی اور معاشی ناانصافی کو ختم کریں۔ درحقیقت تمام مذاہب کا مقصد انصاف، محبت، رحم، بیواؤں اور یتیموں کا تحفظ اور دیکھ بھال، اور غریبوں اور مجبوروں کے ساتھ ہمدردی کو عام کرنا ہے۔ یہ واضح ہے کہ غریبوں سے مناسب سلوک اُن لوگوں کی سب سے بڑی ترجیح ہونی چاہیے جو امریکی پالیسیوں کی صورت گری کرنے والوں میں اہم مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت اسے سب سے اہم پیمانہ بنایا جا سکتا ہے تاکہ ہماری قوم کی بنیادی اخلاقی اقدار کی حمایت کا اعتراف کرنے والوں کو اس کے ذریعے پرکھا جا سکے۔

Marfat.com

جب 2000ء شروع ہوا تھا تو مجھے ایک اہم فورم پر خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے اس سوال کا جواب دینا تھا: ''نئی ہزاری میں دنیا کا سب سے بڑا چیلنج کون سا ہو گا؟'' یہ ایک دلچسپ موضوع تھا۔ میں نے قدرے تشکیک کے ساتھ جواب دیا کہ ہمیں جس سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے، وہ کرۂ ارض کے امیر اور غریب لوگوں میں بڑھتا ہوا فرق ہے۔ نہ صرف ان دونوں کے مابین بے پناہ عدم مساوات ہے بلکہ ان کا درمیانی فاصلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ گذشتہ صدی کے آغاز پر دنیا کے دس امیر ترین ملک غریب ترین ملکوں سے نو گنا زیادہ امیر تھے۔ 1960ء میں یہ شرح 3.1 تھی۔ اس صدی کے شروع میں دنیا کے بیس امیر ترین ملکوں میں فی کس (Per Person) اوسط آمدنی 27591 ڈالر تھی جبکہ غریب ترین ملکوں میں فی کس اوسط آمدنی صرف 211 ڈالر تھی۔ یعنی 1:131!

یہ بات فخر کیے جانے کے قابل ہے کہ امریکہ میں اوسط خاندان کی سالانہ آمدنی 55000 ڈالر ہے لیکن ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے آدھے سے زیادہ لوگ دو ڈالر روزانہ سے کم پر زندہ ہیں جبکہ ایک ارب بیس کروڑ لوگوں کو صرف ایک ڈالر روزانہ پر گذارا کرنا پڑتا ہے۔ صرف لمحہ بھر کے لیے تصور کریں کہ ہمیں ایک ڈالر روزانہ پر گذارا کرنا ہو تو کیا ہو گا...............صرف ایک ڈالر کھانے کے لیے، رہائش کے لیے اور لباس کے لیے۔ واضح بات ہے کہ حفظانِ صحت اور تعلیم کے لیے تو کچھ نہیں بچے گا، اور ہماری عزتِ نفس یا روشن مستقبل کی امید کا باقی رہنا تو مشکل ہو گا۔

میرے تقریباً سارے امریکی قارئین اور میرے اپنے گھرانے کے افراد ان لوگوں میں سے ہیں جن کی آمدنیاں اچھی خاصی ہیں، لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں غریبوں کے حالات کا علم ہے۔ گذشتہ بیس برسوں کے دوران میں اور میری بیوی روزالن نے ''دی کارٹر سینٹر'' کی نمائندگی کرتے ہوئے دنیا کے 120 سے زیادہ ملکوں کے دورے کیے ہیں۔ ان دوروں کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ان ملکوں کے لوگ کیا ہیں اور اپنی ضرورتوں کو کس طرح پورا کرتے ہیں۔ اب ہمارے امدادی پروگرام 65 ملکوں میں چل رہے ہیں۔ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ان میں سے

Marfat.com

35 ملک نیم صحارائی افریقہ میں ہیں۔ ہم ہمیشہ یاد رکھتے ہیں کہ انسانی حقوق کے عالمی اعلامئے میں سب انسانوں کے معیاری روزگار کی بھی ضمانت دی گئی ہے جو کہ ان کی اور ان کے گھرانے کی صحت منداور اچھی زندگی کے لیے کافی ہو۔

میں نے نئی ہزاری کے آغاز پر اپنی تقریر میں اس معیار کو پورا کرنے کے لیے چند تجاویز پیش کی تھیں، جن میں یہ تجاویز بھی شامل تھیں کہ ترقیاتی امداد میں اضافہ کیا جائے، غریب ترین ملکوں کے قرض معاف کر دیئے جائیں، امن کو لاحق خطرات کے پرامن حل تلاش کیے جائیں، غریبوں کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے، لوگوں کو اتھارٹی اور ان کے معاملات کی ذمہ داری انہی کو دی جائے، امداد دینے والے ملکوں میں تعاون بڑھایا جائے، اور شدید مایوس کن غربت کا انسانی حقوق، تشدد اور پرتشدد اقدامات کے لیے غریبوں کی بھرتی کے لیے آمادگی پر ناگزیر اثرات کو بھانپا جائے۔

ہمارے سینٹر کے پروگراموں سے عیاں ہوا ہے کہ محدود وسائل کو دانائی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انتہائی غریب لوگ بہت زیادہ ذہانت، ایجاد پسندی اور متاثر کن کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دی کارٹر سینٹر میں صرف 150 افراد کام کرتے ہیں......... ان میں لینڈ سیکپرز سے لے کر ری سپشنسٹوں تک کے علاوہ افریقی بستیوں میں متعین ماہرین بھی شامل ہیں......... اس لیے ہمیں اپنے کام کے اثر کو بڑھانے کے لیے دوسرے لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ بیشتر پروجیکٹس کے لیے میں متعلقہ ملک کے چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ ایک پیشگی معاہدہ کر لیتا ہوں، جس میں عموماً یہ طے کیا جاتا ہے کہ ہم صرف ایک غیر ملکی ماہر مہیا کریں گے، ہم مقامی شہریوں کو تربیت دیں گے، اور انہی کو ضروری کام کرنے ہوں گے، جن کا معاوضہ ان کی حکومت انہیں دے گی۔ ہم نے انہیں نہایت مخلص اور اہل پایا ہے۔

ہم نے گذشتہ بیس موسموں میں ساٹھ ہزار افریقی کاشت کار گھرانوں کو زیادہ اجناس اگانے کے طریقوں کی تعلیم دی ہے۔ ان اجناس میں بنیادی طور پر مکئی، چاول اور گندم وغیرہ شامل ہیں۔ صرف دس ڈالر فی خاندان سالانہ خرچ کر کے انہیں بیج درست طریقے سے بونا، جڑی بوٹیوں پر قابو پانا، بہترین وقت پر فصل کاٹنا، کٹی ہوئی

Marfat.com

فصل کو ذخیرہ کرنا، اور زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب مقدار میں کھاد استعمال کرنا سکھایا گیا ہے۔ وہ دستی آلات اور غیر مشینی (مینوئل) محنت کے ذریعے اپنی پیداوار کو دگنا یا تین گنا بڑھانے کے قابل ہو گئے۔

ہم نے گنی وارم (Guniea Worm) نامی بیماری کو مٹانے میں بھی مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہماری پوری معلوم تاریخ میں موجود رہی ہے۔ دیہاتی لوگ بارش کے موسم میں بھرنے والے تالابوں سے پانی پیتے ہیں۔ اس پانی میں اس کیڑے کے انڈے ہوتے ہیں، جو کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پروان چڑھتا ہے۔ ایک سال بعد جسم کے اندر انڈے سے کیڑا نکل آتا ہے، جو کہ تقریباً 30 انچ لمبا ہوتا ہے۔ یہ کیڑا اندر سے انسان کو کاٹتا ہے، جس سے بننے والا زخم عضلاتی ٹشوز کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس مرض کا شکار شخص شدید تکلیف اور درد محسوس کرتا ہے۔ مریض پیاس اور درد کی شدت میں بار بار پانی میں اتر جاتا ہے۔ ایک ماہ کے اندر اندر کیڑا بے شمار انڈے دیتا ہے اور پھر جسم سے نکل جاتا ہے۔

روزالن اور میں نے سب سے پہلے گھانا کی ایک دور افتادہ بستی میں گنی وارم کی تباہ کاری دیکھی تھی، جہاں کے دو تہائی لوگوں کے جسموں سے کیڑے نکل چکے تھے۔ ان میں بہت سوں کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ گھسٹ گھسٹ کر بھی ہماری پذیرائی کے لیے اپنی جھونپڑی سے بستی کے چوپال تک نہیں آسکے تھے۔ مجھے وہ خوب صورت نوجوان لڑکی نہیں بھولتی جس کی چھاتی کی بھٹنی (Nipple) سے کیڑا نکل رہا تھا۔ بعد میں اس لڑکی کے جسم کے دوسرے حصوں سے گیارہ مزید کیڑے نکلے تھے۔

ہم نے ہندوستان، پاکستان، یمن اور نیم صحارائی افریقہ کے اٹھارہ ملکوں کی 23700 بستیوں میں اس کے مرض کے شکار 35 لاکھ افراد پائے اور ہر متاثرہ بستی کے لوگوں کو اپنی حفاظت خود کرنے کے طریقے سکھانے کا کام آہستہ آہستہ اور ایک منظم انداز میں شروع کیا۔ ہم نے انہیں ڈیو پونٹ (Dupont) کی طرف سے عطیہ کردہ مخصوص کپڑا دیا، جس کے ذریعے وہ پانی وغیرہ کو چھان سکتے تھے، اپنے تالابوں میں موجود کیڑوں کے انڈوں کو تلف کرنے کے لیے کیڑے مار ادویہ استعمال کر سکتے تھے یا

Marfat.com

گہرے کنوؤں سے پانی بھر سکتے تھے۔ اگر ہر بستی ایک سال تک ان حفاظتی تدابیر پر عمل کرلے، اور متاثرہ افراد پانی سے باہر رہیں تو تالاب میں مزید نئے انڈے نہیں جائیں گے اور نہ ہی بیماری پھیلائیں گے۔ یوں منحوس چکر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا۔ لوگوں کی بے لوث محنت کا نتیجہ قابلِ دید تھا۔ اب صرف آدھے فی صد سے بھی کم نئے مریض سامنے آئے ہیں اور ہم چند باقی ماندہ متاثرہ بستیوں پر پوری توجہ دینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

دریائی اندھے پن (River Blindness) سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ''دی کارٹر سینٹر'' نے 2004ء میں مرک اینڈ کو کی عطیہ کردہ دواؤں کی مدد سے افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کا علاج کیا۔ اگرچہ افریقہ میں یہ مسئلہ بہت سنگین ہے اور مریضوں کو کئی سال تک دوا دینی پڑتی ہے تاہم ہمیں معلوم ہوا کہ سال میں دوبارہ دوا دینے سے 85 فی صد سے زیادہ متاثرہ لوگ شفایاب ہو گئے۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے اس پورے نصف کرے سے دریائی اندھے پن کا نام نشان مٹ جائے گا۔ ہمیں توقع ہے کہ ہم 2007ء میں اس ہدف کو پالیں گے۔

''دی کارٹر سینٹر'' کے دیگر جاری ہیلتھ پروگراموں میں ٹراکوما (Trachoma) پر کنٹرول خصوصی طور پر دلچسپ ہے۔ یہ بیماری ایک انفیکشن ہے جو کہ گندی آنکھوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بچ جا سکنے والے اندھے پن کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دور سے ہم کسی مسائی یا ڈِنکا بستی کے بچوں کو دیکھ کر یہ سوچتے تھے کہ انہوں نے عینکیں لگائی ہوئی ہیں لیکن جب ہم پاس پہنچتے تو پتا چلتا کہ یہ تو سیاہ مکھیاں ہیں جو رطوبت کے لیے ان کی آنکھوں پر اکٹھی ہو چکی ہیں۔ ٹراکوما کے شکار فرد کی آنکھ کا اوپر والا پپوٹا اندر کی طرف مڑ جاتا ہے، مریض پلکیں جھپکتا ہے تو پلکیں قرنیہ سے ٹکراتی ہیں، نتیجتاً وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میں نے جنوب مشرقی جارجیا میں اس بیماری کے چند مریضوں کو دیکھا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے بہت غریب ہمسایوں میں سے چند ایک کے مکانوں کے عقبی صحن میں ہی بیرونی بیت الخلا ہوتا تھا، جیسا کہ ہمارے گھر میں تھا، اور مکھیاں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔

''دی کارٹر سینٹر'' نے فائزر کی عطیہ کردہ ایک اینٹی بائیوٹک گو... بڑھتی ... کی تنخواہوں

Marfat.com

دی، انہیں چہرا دھونے اور آنکھ کے پپوٹے کی سادہ سی سرجری کا طریقہ سکھایا اور بستی کا فضلہ ٹھکانے لگانے کی ہدایت کی تاکہ مکھیوں کا بادل چھٹ جائے۔ وہاں عمومی رواج یہ تھا کہ لوگ اپنے گھروں کے اردگرد کھلے میدان میں پیشاب یا پاخانہ کرتے تھے جیسا کہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں بہت پرانے زمانے میں ہوتا تھا۔ صرف تین سال پہلے ہم نے دیہاتیوں کو سکھانا شروع کیا کہ کیسے زمین میں ایک گڑھا کھودنا ہے، اس کے گرد کچی اینٹ یا کنکریٹ کا گھیرا رکھنا ہے اور کسی قسم کا پردہ لٹکانا ہے۔

ان نئی لیٹرینوں کے حوالے سے لوگوں کے ردِعمل نے ہمیں حیران کر دیا، بالخصوص ایتھوپیا میں، اور یہ جان کر کہ ان لیٹرینوں کو تعمیر کرنے کا سب سے زیادہ شوق عورتوں نے ظاہر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرد دن کے کسی بھی وقت کہیں بھی کھلے میں رفعِ حاجت کر سکتے تھے، البتہ عورتوں کے لیے رات کے سوا رفعِ حاجت کے لیے کھلے مقامات پر جانا سخت ممنوع تھا۔ اب عورتوں کی آزادی کو زندگی مل چکی ہے، اور مختصر سے عرصے میں ایتھوپیا کے ایک حصے میں 89500 لیٹرینیں تعمیر کر لی گئی ہیں۔

ان سارے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ غریب ترین لوگوں کی ضرورتوں کو نمایاں کیا جائے نیز یہ واضح کیا جائے کہ جب انہیں (امیر لوگوں کی طرف سے) اپنی زندگیاں بہتر بنانے کا باوقار موقعہ دیا جائے تو وہ جوش کے ساتھ مؤثر جواب دیتے ہیں۔

ہمارا پورا معاشرہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تقسیم کالے، گورے یا ہسپانوی کے درمیان ہو بلکہ یہ تقسیم امیر اور غریب کے درمیان ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگوں تو کسی ایک غریب سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ہاں کوئی گھریلو ملازمہ یا ملازم ہو تو امکان یہی ہے کہ ہم کبھی ان کے گھروں میں نہیں جائیں گے اور ان کے کچن میں کافی کا ایک کپ نہیں پئیں گے یا ان کے ٹین ایج بچوں کے ناموں سے واقف نہیں ہوں گے .... یا خداوند معاف کرے انہیں اپنے گھروں میں آنے کی دعوت نہیں دیں گے یا ان کے بچوں اپنے بچوں کے ساتھ بیس بال کھلانے نہیں لے جائیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ ہم میں سے وہ لوگ بھی جو یسوع مسیح کو

Marfat.com

نجات دہندہ مانتے ہیں، الگ تھلگ زندگی گزارنے کی طرف مائل ہیں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ گہرے ذاتی تعلقات قائم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔خودروزالن اور میں ایسا کرنے میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہیں۔

ضرورت مند لوگوں تک پہنچنے کا ایک سب سے زیادہ فطری طریقہ یہ ہے کہ ہیبی ٹیٹ فار ہیومینٹی (Habitat For Humanity) سے مدد لی جائے ،جس کا بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر ہمارے گھر سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ ہماری وائٹ ہاؤس کے بعد کی زندگی کا یہ ایک حیرتناک حد تک مشہور معمول بن چکا ہے کہ ہم چندہ اکٹھا کرتے ہیں اور رضا کاروں کے ایک گروپ کے ساتھ دنیا میں کسی جگہ سال میں صرف ایک ہفتے کے لیے جا کر وہاں بے گھروں کے لیے گھر تعمیر کرتے ہیں۔ ہم گذشتہ بیس سے زیادہ برسوں سے امریکہ کے گیٹو ایریاز (Ghetto Areas)، دیہاتوں، اور ایک مقامی امریکی ریزورویشن (Native American Reservation) میں جا کر یہ خدمت انجام دے چکے ہیں۔اس کے علاوہ میکسیکو، کینیڈا، کوریا، فلپائن، ہنگری، اور جنوبی افریقہ میں بھی یہ خدمت انجام دے چکے ہیں۔ہم نے 2006ء میں ہندوستان میں گھر بنانے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔

ہم غریب گھرانوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تا کہ وہ گھروں کے مالک بن سکیں۔ ''ہیبی ٹیٹ'' (Habitat) انجیل کے اس حکم پر عمل کرتی ہے کہ سود لینا منع ہے۔ یہ ہمارے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے بڑا پُر لطف اور دل کو گرما دینے والا موقعہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے مذہبی عقیدے کو عمل میں ڈھالتے ہیں۔اس سے واضح طور پر عیاں ہوتا ہے کہ ضرورت مند لوگوں تک پہنچنا کتنا اہم اور ضروری ہے۔

مجھے ''ہیبی ٹیٹ'' کے ایک اخبار میں شائع ہونے والا کارٹون ہمیشہ یاد آتا ہے۔اس میں ایک بستی کا منظر دکھایا گیا ہے، شاید کوئی جہاز ہوا میں اڑ رہا ہو۔ کچھ لوگ ٹینس کھیل رہے ہیں، کچھ تو سائیکلوں پر سوار جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ گاڑیوں میں سوار جا رہے ہیں، کچھ لوگ سکول میں پڑھا رہے ہیں، کچھ لوگ ٹریکٹروں سے شاید ہل چلا رہے ہیں اور ان سب کے سروں پر ننھے ننھے بلبلوں میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ''صرف

Marfat.com

ایک آدمی کیا کرسکتا ہے؟'' ملا کر دیکھا جائے تو ایک معمولی سا فرد اپنے عزیزوں کی دیکھ بھال کرتا ہے، دوستیاں نبھاتا، عفو و درگزر سے کام لیتا ہے، اور محبت کرتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ہمسائے سے مختلف ایک زبردست استعداد والی فوج بنا سکتا ہے۔

اگرچہ امریکی عوام بہت فیاض اور نرم دل ہیں لیکن ہماری حکومت کی طرف سے دوسرے ملکوں کے غریبوں کے لیے دی جانے والی امدادی رقم شرمناک حد تک کم ہے۔ غیر ملکوں کے لیے امریکہ کی بیشتر حکومتی امداد دوست ملکوں اور فوجی اتحادیوں کو جاتی ہے اور واشنگٹن باقی ہر قسم کی امداد کو ہر قسم کی سیاسی شرائط سے جوڑ دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ ہمارا عظیم ملک کرۂ ارض کے انتہائی غریب لوگوں کے لیے اپنی دولت کا ایک قابلِ احترام حصہ نکالنے کی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہا ہے۔

سرد جنگ کے دوران امریکہ اور سوویت یونین میں دنیا کے غریب ترین ملکوں کو امداد دے کر اپنے اپنے سیاسی اور فوجی مداروں میں لانے کا مقابلہ جاری تھا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دونوں پارٹیاں انسانی ضرورتوں کی طرف سے بے حسی کا مظاہرہ کرتی آئی ہیں۔

مارچ 2001ء میں مجھے دی کارٹر سینٹر کی نمائندگی کرتے ہوئے مونٹیری، میکسیکو میں منعقدہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ کانفرنس اقوامِ متحدہ نے انتہائی غربت اور بچوں کی اموات کے جڑواں مسئلوں پر غور کرنے کے لیے منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں کافی تعداد میں دنیا کے چوٹی کے سیاسی لیڈر شریک تھے، جن میں امریکہ کے صدر بھی شامل تھے۔ ان لیڈروں نے اس ''ہزاری کے چیلنج'' سے نبرد آزما ہونے کے لیے فنڈز میں بہت زیادہ اضافوں کے وعدے کیے۔ ان وعدوں کو سن کر ہم میں سے بہت سے لوگ بہت زیادہ خوش اور پرجوش ہو گئے تھے لیکن امریکہ کی کارکردگی نے ہمارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔

غیر ضروری طور پر فاقہ کشی اور مصیبتوں کے شکار لوگوں کے لیے اپنی دولت کا کچھ حصہ وقف کر دینا ایک ایسی قدر ہے کہ جس سے کسی ملک کی اخلاقی اقدار ماپی جاتی ہیں جبکہ ہمارے ملک کی صورتِ حال عجیب اور کسی حد تک پریشان کن ہے۔ امریکی

Marfat.com

لوگ دوسروں کی مدد فیاضی کے ساتھ کرتے ہیں .... اور انہیں یقین ہے کہ ہماری حکومت ہمارے وفاقی بجٹ کا 15 فی صد غیر ملکی امداد میں دیتی ہے۔ تاہم درحقیقت ہم تمام صنعتی ملکوں میں سب سے زیادہ کنجوس ہیں۔ عمومی طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی دولت کا تیرہواں حصہ وقف کر دیتے ہیں۔ ہماری خام قومی آمدنی (GNI) تقریباً 11 کھرب ڈالر ہے اور ہم ہر 100 ڈالر میں سے صرف تیرہ سینٹ غریب ملکوں کو دیتے ہیں۔ اگر ہم امریکی فاؤنڈیشنز اور دوسرے نجی ذرائع سے دیئے جانے والے عطیات کو بھی حکومتی فنڈز میں ملا دیں تب بھی ہماری قومی آمدنی کے 100 ڈالر میں سے صرف 22 سینٹ امداد بنتی ہے۔

جب بعض اچھے خاصے آگاہ امریکیوں کو ان شرم انگیز حقائق کا بتایا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم المیوں کی صورت میں بہت فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسا کہ ایشیا میں حالیہ سونامی کے بعد ہم نے دل کھول کر مدد دی ہے۔ یہ سچ ہے، اور ہمارے شہریوں کا ایک قابلِ تعریف وصف ہے لیکن بیشتر لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے کہ لوگوں کی مستقل تکالیف میں ان کی مدد کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ سونامی کی وجہ سے گیارہ ملکوں میں دو لاکھ ہلاکتیں ہوئیں لیکن ہر ماہ ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ہلاکتیں ملیریا سے، ایک لاکھ چالیس ہزار ہیضے سے، اور دو لاکھ چالیس ہزار ایڈز سے ہو رہی ہیں! اگر ہر امریکی اور یورپی شہری 2.50 ڈالر سالانہ عطیہ دے تو ملیریا کے خلاف عالمگیر جنگ مؤثر انداز سے لڑی جا سکتی ہے۔

حد تو یہ ہے کہ غیر ملکی امداد کے یہ پریشان کن حد تک کم اعداد و شمار بھی گمراہ کن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں وہ خصوصی امداد بھی شامل ہے جو ''سٹریٹجک'' ملکوں کو دی جاتی ہے (ان میں سے بیشتر درمیانی آمدنی والے ملک ہیں لیکن انہیں اہم سیاسی پارٹنر تصور کیا جاتا ہے)۔ اس کے علاوہ ہماری غیر ملکی امداد کا اچھا خاصا حصہ وہ اضافی اجناس ہوتی ہیں جنہیں امریکہ میں فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ (ان میں سے تقریباً آدھی اجناس ٹرانسپورٹیشن کے خرچے میں شمار کی جاتی ہیں)۔ تعلیم، صحت، رہائش یا نکاسی آب کے لیے بچ رہنے والی رقم شاذ ہی مقامی لوگوں تک پہنچتی ہے، اس کا بیشتر حصہ ضرورت

Marfat.com

مند ملکوں میں خود کو متعین کروا لینے والے امریکی مشیر سمیٹ لے جاتے ہیں۔

صدر بش نے جون 2005ء میں 1.2 ارب ڈالر مالیت کے ایک پانچ سالہ پروگرام کا اعلان کیا۔ جس کا مقصد پندرہ افریقی ملکوں میں ملیریا کے خلاف مہم چلانا تھا۔ ان ملکوں کے ساڑھے سترہ کروڑ افراد ملیریا کے خطرے کا شکار ہیں۔ اگر وعدہ پورا کر دیا گیا تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ امریکہ میں اور امریکہ سے باہر فیاضی کے چرچے تو بہت ہیں لیکن وائٹ ہاؤس بیشتر گذشتہ وعدوں کو فراموش کر چکا ہے، یا انہیں کانگرس نے ردّ کر دیا ہے، یا انتظامی پیچیدگیوں میں ایسا الجھایا گیا ہے کہ ضرورت مند لوگوں تک حقیقت میں بہت کم مدد پہنچی ہے۔

مونٹیری کانفرنس کے فوری بعد صدر جارج ڈبلیو بش نے 5 ارب ڈالر سالانہ کے ''ملینیئم چیلنج فنڈ'' نامی ترقیاتی امدادی پروگرام کا اعلان کیا لیکن تین سال بعد صرف چار لاکھ ڈالر (اعلان کردہ رقم کے ایک فی صد سے بھی کم) تقسیم کیے گئے۔ واشنگٹن کے چھوٹے سرکاری اعلانات کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ اعلان کیا گیا کہ امریکہ بوٹسوانا کے ایڈز کے 41000 مریضوں کو زندگی بڑھانے والی ادویات فراہم کرے گا۔ بوٹسوانا کے معالجاتی پروگرام کے چوٹی کے منتظمین مشتعل تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں امریکہ سے کوئی امداد نہیں ملی۔ انہوں نے امریکہ کے دعوؤں کو ''جھوٹ، اور حقائق کی غیر مہذبانہ تعبیر'' قرار دیا۔ بوٹسوانا میں امریکہ کی مدد سے زیر علاج مریضوں کی درست تعداد ہے: صفر۔

امریکہ کا ملیریا کے خلاف لڑنے کا سالانہ غیر ملکی امداد کا بجٹ 9 کروڑ ڈالر ہے لیکن اس میں سے 95 فی صد مشیروں پر صَرف ہو جاتا ہے اور مچھر دانیوں، دوائیوں اور مچھر مار ادویات کے چھڑکاؤ پر محض 5 فی صد خرچ کیا جاتا ہے۔ کنساس سے تعلق رکھنے والے ایک کنزرویٹو سینیٹر سام براؤن بیک نے اس پالیسی پر تنقید کی اور حکومت کو ملیریا کے علاج پر آدھا ملیریا بجٹ خرچ کرنے کے لیے مجبور کرنے کے واسطے ایک بل سینیٹ میں پیش کیا۔ سینیٹر براؤن بیک نے نشان دہی کی کہ حکومت کی ویب سائٹ پر حکومت کی ٹھیکیداروں کی فہرست کو چار سال سے اَپ ڈیٹ نہیں کیا گیا۔ انہوں نے کہا

Marfat.com

کہ انہیں محض ''لایعنی بیانات اور اعداد و شمار مہیا کیے گئے ہیں، جو کسی کام کے نہیں ہیں۔'' انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت کا محکمۂ احتساب ملیریا بجٹ کا آڈٹ کرے۔

یو این ملینیئم پروجیکٹ کے ڈائریکٹر جیوی ساش کے بقول امریکہ نے نیم صحارائی افریقہ کے لیے 2003ء میں تقریباً تین اَرب ڈالر مدد دی۔ جس میں سے صرف 118 ملین ڈالر امریکہ کے دورانِ ملک آپریشنز اور افریقی حکومتوں اور کمیونیٹوں کے پروگراموں کی براہِ راست مدد کے لیے رہ گئے .... کم آمدنی والے ملکوں کے ساڑھے چھ کروڑ لوگوں کے لیے صرف 18 سینٹ فی کس .... ان 118 ملین ڈالروں کو صحت، تعلیم، سڑکوں، بجلی، پانی، نکاسی آب اور خطے کے جمہوری اداروں پر خرچ کیا جائے گا۔'' یاد رہے کہ یو این ملینیئم پروجیکٹ مونیٹری میں کیے گئے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔

ملینیئم پروجیکٹ نے تخمینہ لگایا ہے کہ ضرورت مند لوگوں کی مدد کے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے 2006ء میں خام قومی آمدنی کے ہر ڈالر میں سے 44 سینٹ خرچ کرنے پڑیں گے اور 2015ء میں تقریباً 70 سینٹ۔ صرف تقابل کے لیے 2001ء سے امریکہ کے دفاعی اخراجات میں اضافہ ملاحظہ کیجیے۔ 2001ء سے خام قومی آمدنی کے ہر 100 ڈالر میں سے 1.70 ڈالر دفاع پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ جبکہ ٹیکس کٹوتیاں (خصوصاً دولت مند امریکیوں کے لیے) خام قومی آمدنی کے ہر 100 ڈالر میں سے 3.30 ڈالر تھیں۔

ہمیشہ فیاضی کا مظاہرہ کرنے والے بیلجیئم، سویڈن، نیدرلینڈز، لکسمبرگ، ڈنمارک اور ناروے پہلے ہی 2015ء کے عدد سے آگے نکل گئے ہیں جبکہ اٹلی، فرانس، جرمنی اور انگلینڈ نے بھی اسی ہدف کو پانے سے اتفاق کیا ہے۔ ذمہ داریاں نبھانے میں ہماری ناکامی دوسرے ملکوں کے لوگوں کے سامنے زیادہ عیاں ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اَمر یقینی ہے کہ مستقبل میں لوگ ان اختلافات کو زیادہ کھل کر بیان کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حوالے سے امریکہ پر تنقید یا اس کی مذمت کی جائے اور لوگ امریکہ کو مضبوط اخلاقی اقدار والے طاقتور ملک کے طور پر پیش نہیں کریں گے۔ ابھی حال ہی میں

Marfat.com

ہماری حکومت نے بھی دوسری حکومتوں کے ساتھ مل کر طویل المیعاد قرضے معاف کرنے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن امریکہ ان ملکوں کی امداد میں کمی کر دے گا۔ اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر واشنگٹن میں کوئی مضبوط لیڈر شپ ہو تو ہمارے ملک کے عوام عظیم فیاضی کا مظاہرہ کریں گے۔

ہمارے اپنے ملک میں غریبوں اور امیروں کے ساتھ ہماری حکومت کے سلوک میں بڑھتا ہوا فرق اَب امریکی شہریوں پر زیادہ عیاں ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں پہلے ہی لوگوں کی آمدنیوں میں بہت زیادہ فرق ہے اور یہ عدم مساوات تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس فرق کی ایک علامت کسی ملک کے پانچویں حصے کے سب سے اوپر اور سب سے نیچے والے لوگوں کی آمدنیوں کی نسبت ہوتی ہے، جو کہ جاپان میں چار اور ایک، فرانس میں سات اور ایک جبکہ امریکہ میں گیارہ اور ایک ہے۔ اس کے باوجود 2000ء سے واشنگٹن نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں، سب امیروں کے حق میں جاتے ہیں، اکثر مڈل کلاس ورکنگ فیملیز اور ضرورت مندوں کی قیمت پر جبکہ ٹیکس اور اخراجات کے حوالے سے بنیادی قانون سازی ان رجحانات کو دوام دینے کے لیے کی گئی ہے۔ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ سلامتی کی ضروریات اور موجودہ مراعاتی پروگراموں پر ضرور رقوم خرچ کی جائیں گی اور ہمارے عدیم النظیر خساروں کی وجہ سے صحت، تعلیم، بہبود، رہائش، ماحول یا روزگار کی فراہمی کی موجودہ سطحوں کو برقرار رکھنے .... پر بہت تھوڑی رقم خرچ کی جائے گی۔ بہت کم بڑھانے ....

2000ء سے جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے، وہ تقریباً ناقابلِ یقین ہے۔ اس زمانے میں کانگرس کے بجٹ آفس نے 2001ء میں 281 اَرب ڈالر فاضل ہونے کا اندازہ لگایا تھا، جس میں دس سال کے اندر 5.6 کھرب کا اضافہ ہونا تھا۔ اس کی بجائے 2005ء میں وفاقی بجٹ خسارہ تقریباً 4 اَرب ڈالر ہوگا۔ جبکہ خرچ کی سطح تقریباً جوں کی توں رہے گی لیکن دولت مند امریکیوں کو ٹیکس میں مسلسل چھوٹ دینے سے محاصل میں غیر معمولی کمی ہوگی۔ اندازہ ہے کہ اس سطح کا خسارہ جاری رہے گا۔ ریگن بش حکومتوں کے دوران قومی قرض ایک کھرب ڈالر سے بڑھ کر چار کھرب ڈالر ہو گیا

Marfat.com

ہے اور 2001ء سے کانگرس کو قرض کی حد 8 کھرب ڈالر تک بڑھا دینا پڑی ہے۔ جبکہ اگلے چار سال میں یہ رقم 10 کھرب ڈالر تک پہنچ جائے گی۔

اس پالیسی پر عمل کے نتیجے میں داخلی پروگرام محدود ہو جائیں گے۔ سچے ایمان والے قدامت پرستوں کا یہ بہت پرانا مقصد رہا ہے۔ وہ سوشل سکیورٹی، میڈک ایڈ، میڈی کیئر، ہیڈ سٹارٹ اور دوسرے انسان دوستانہ پروگراموں کے آغاز سے ہی ایسے پروگراموں کے خلاف سرگرم رہے ہیں۔ یہ قدامت پرست فریڈکلن روز ویلٹ، ہیری ٹرومین، اور لنڈن جانسن کی طرف سے شروع کیے گئے مذکورہ بالا پروگراموں پر ناخوش اور انہیں ختم کروانے کے درپے تھے۔ وراثتی ٹیکس ری پبلکن صدر تھیوڈور روز ویلٹ کے دور میں لگایا گیا تھا اور اَب اسے بھی ختم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں

.........امریکہ کے امیر ترین خاندانوں کے لیے ٹیکس کے بوجھ میں مزید کمی۔

بجٹ کے غیر معمولی خسارے ملک میں یا ملک سے باہر اخراجات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ 1962ء میں وفاقی خرچ ہماری معاشی پیداوار کا صرف 19 فی صد تھا اور یہ مختلف ادوار میں اکثر 20 فی صد سے زیادہ ہوتا رہا ہے۔ اب عراق جنگ اور داخلی دفاع پر بھاری رقوم خرچ کرنے کے باوجود خرچ قومی معاشی پیداوار کا 20 فی صد ہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ ٹیکس رعایتوں کی وجہ سے وفاقی محاصل کو 16 فی صد تک گھٹا دیا ہے، جو کہ جدید تاریخ میں سب سے کم سطح ہے۔ ان دونوں اعداد کا فرق خسارے کی وسعت ظاہر کرتا ہے۔

2000ء سے کانگرس کی طرف سے دی جانے والی ٹیکس رعایتوں کی وجہ سے ہر مڈل کلاس خاندان کے ایک ڈالر کے مقابلے میں چوٹی کے ایک فی کس گھرانے 54 ڈالر وصول کریں گے، جبکہ دس لاکھ یا اس سے زیادہ آمدنی والے گھرانوں کو 191 ڈالر کا فائدہ ہوگا! پہلے تین برسوں کے دوران غربت میں جینے والے امریکیوں کی تعداد بڑھ کر 35 لاکھ ہوگئی جبکہ 400 امیر ترین امریکیوں کی آمدنی میں صرف 2000ء میں 10 فی صد اضافہ ہوا۔ حالیہ برسوں میں امیروں اور غریبوں میں بڑھتی ہوئی تقسیم کی ایک اور علامت یہ ہے کہ کارپوریٹ چیف ایگزیکٹو افسروں کی تنخواہوں

Marfat.com

میں اضافہ ورکروں کی اوسط تنخواہ سے 40 گنا سے 400 گنا زیادہ ہوا ہے۔ کارپوریٹ منافعوں میں بہت زیادہ اضافوں کے باوجود 2004ء میں اوسط ورکروں کی تنخواہوں میں افراطِ زر کی وجہ سے کمی ہوگئی .... یہ کئی سال بعد اس قسم کی پہلی کمی تھی۔

ہماری داخلی معیشت میں ان ریڈیکل تبدیلیوں پر مستزاد ہمارے تیزی سے بڑھتے ہوئے بین الاقوامی قرض نے آزاد مالیاتی ماہرین میں بہت زیادہ تشویش اُبھار دی ہے۔ امریکی غیر ملکیوں کے بہت زیادہ مقروض ہوگئے ہیں اور چار یا پانچ سال میں قرض دگنا ہو جائے گا۔ مارچ 2005ء میں Warren Buffet's Berkshire Hathaway کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے: ''امریکہ اگلے دس سال میں دوسرے ملکوں اور ان کے شہریوں کا 11 کھرب ڈالر کا مقروض ہو جائے گا (ہماری موجودہ خام قومی آمدنی کے تقریباً برابر) ''مقروض معاشرہ'' کہلانے والا ملک ایک ''شیئر کروپر سوسائٹی'' میں خوشی نہیں پائے گا۔ تاہم تجارتی پالیسیاں، جنہیں ری پبلکن اور ڈیموکریٹ، ہر دو کی تائید حاصل ہے، ہمیں اسی طرف لے جا رہی ہیں۔''

مجموعی معاشی فلسفے سے مطابقت رکھنے والی وال سٹریٹ کی خواہش ہے کہ سوشل سکیورٹی فنڈز سے سٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کر دی جائے۔ وال سٹریٹ کی یہ خواہش چوٹی کے سیاست دانوں کا ایک بڑا مقصد بن گئی ہے، تاہم امریکی شہری صدر کی طرف سے چلائی گئی ملک گیر مہم کو رد اور کانگرس کو یہ تجویز منظور نہ کرنے پر مجبور کر چکے ہیں۔

بڑے تجارتی اداروں کو مزید نوازنے کے لیے 2003ء میڈی کیئر ڈرگ بل امریکی حکومت کو ادویات کی قیمتوں میں کمی کے لیے مذاکرات کرنے سے روکتا ہے اور ادویات ساز کمپنیاں کینیڈا اور دوسرے ملکوں کے اپنے گاہکوں کی نسبت امریکیوں سے زیادہ قیمتیں وصول کرنا جاری رکھ سکتی ہیں۔ کانگرس کا بجٹ آفس کہتا ہے کہ غیر ملکی ادویات کی قیمتیں امریکی قیمتوں سے 35 تا 55 گنا کم ہیں۔ اس خصوصی پروویژن کی زد میں نہ آنے والا ڈیپارٹمنٹ آف ویٹرن افیئرز قیمتوں میں 50 یا اس سے زیادہ فی صد رعایت کے لیے مذاکرات کر رہا ہے۔

Marfat.com

یہ واضح ہے کہ مؤثر لابی کار بھاری رشوتیں دیتے ہیں جیسا کہ تمباکو کی صنعت نے واضح کر دیا ہے۔ میرے لیے یہ بات خصوصاً اشتعال انگیز ہے کیونکہ میرا باپ، ماں، دونوں بہنیں اور واحد بھائی سب کے سب سگریٹ نوشی کے عادی بن جانے کے بعد کینسر سے مر گئے۔ حالیہ برسوں میں اس حوالے سے تھوڑی پیش رفت ہوئی ہے اور اس مہلک پروڈکٹ کے تیار کنندگان سے اپنے متاثرین کی تلافی کرنے اور ہیلتھ ایجوکیشن کے لیے رقوم مہیا کرنے کے مطالبے کیے گئے ہیں (اس میں سے بہت ساری رقم دوسری غیر متعلقہ مدات میں خرچ کر دی گئی ہے)۔ اس دوران تمباکو کمپنیوں نے ایک بہت زیادہ اہم جنگ جیت لی ہے۔ انہوں نے اپنی بہت زیادہ تشہیر یائی (Publicized) پروڈکٹس میں کارسینوجینز[1] کے خلاف کوئی مؤثر وفاقی قانون سازی رکوا دی ہے۔

جون 2005ء میں تمباکو کمپنیوں کے منتظمین امریکی وزارتِ انصاف کے اس اقدام سے بہت حیران ہوئے کہ اس نے حکومت کو اپنی چھ سال سے جاری سگریٹ نوشی ختم کروانے کی کوششوں کے لیے سگریٹ سازی کی صنعت کو رقوم مہیا کرنے پر مجبور کرنے کا کہا۔ مقدمے پر دس کروڑ ڈالر خرچ کرنے اور ماہرین کی اس شہادت کے بعد کہ 25 سال میں ایک کھرب تیس اَرب ڈالر خرچ کیے جانے کی ضرورت ہے، آخری منٹ میں اچانک اعلان کیا گیا کہ یہ مطالبہ اگلے پانچ سال کے دوران صرف 10 اَرب ڈالر تک محدود کر دیا گیا ہے۔ پریزائیڈنگ وفاقی جج نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاید تمباکو کی صنعت کو دی گئی اس ناقابلِ توضیح رعایت کے پیچھے سیاسی عوامل کارفرما ہیں۔

واشنگٹن کے کلیدی سیاسی لیڈروں نے امریکی محنت کشوں کے لیے تشویش کے بہت زیادہ اظہار کے باوجود اجرتوں میں معمولی اضافہ بھی نہیں ہونے دیا۔ گذشتہ آٹھ سال سے 5.15 ڈالر فی گھنٹہ ہی دیا جا رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ افراطِ زر کے مطابق اُجرت اضافہ بھی نہیں کیا گیا۔

---

[1] ایسے مادّے جو کہ کینسر کا باعث بنتے ہیں۔

Marfat.com

(اپریل 2005ء میں کرنسی کی قدر کی اساس پر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ڈالر میں اجرتوں کا فرق ملاحظہ ہو: آسٹریلیا 8.66 ڈالر، فرانس 8.88 ڈالر، اٹلی 9.18 ڈالر، انگلینڈ 920 ڈالر اور جرمنی 12.74 ڈالر)

فرض کیا سال میں 40 گھنٹے فی ہفتہ کے حساب سے 50 ہفتے کام کیا جاتا ہو، تو امریکی محنت کشوں کی کم از کم سالانہ آمدنی 10300 ڈالر بنتی ہے، جو کہ غربت کی سطح سے بھی نیچے ہے۔ یاد رہے دسیوں لاکھ امریکی ان اجرتوں پر کل وقتی (Full-Time) ملازمتیں کر رہے ہیں۔ 2004ء میں ایک بچے والے باپ یا ماں کے لیے سرکاری طور پر غربت کی سطح کانٹی نینٹل امریکہ میں 12490 ڈالر، ہوائی میں 14360 ڈالر، اور الاسکا میں 15610 ڈالر ہے۔ ہمارے غریب عوام بدترین عذاب سہہ رہے ہیں اور ہر سطح کی آمدنی حاصل کرنے والے امریکی شہری تاریخ کے ہر دور سے زیادہ پست سطح پر جی رہے ہیں۔

دولت مندوں کو نوازنے کی ایک اور مثال اس پیشے کی ہے جس سے میں ساری زندگی وابستہ رہا ہوں، یعنی کاشت کاری۔ عظیم مندے (Great Depression) کے زمانے میں زرعی رعایتوں نے کاشت کار گھرانوں کی بقا میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ واضح ہو کہ وہ زرعی رعایتیں کو صرف اِسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے دی گئی تھیں۔ ان رعایتوں کو اب بھی جائز اور درست قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ اَمر شاید حیرانی کا باعث نہ ہو کہ گذشتہ برسوں میں دولت مند کاشت کاروں کو وفاقی حکومت کی طرف سے زیادہ رعایتیں ملیں، جبکہ غریب کاشت کار گھرانوں کو واشنگٹن نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ گذشتہ دس برسوں کے دوران ہم ٹیکس دہندگان کو سالانہ رعایتوں کی مد میں اوسطاً چودہ اَرب ڈالر ادا کرنے پڑے ہیں جبکہ اس میں سے 70 فی صد رقم صرف 10 فی صد کاشت کاروں کو ادا کی گئی، آدھی رقم چوٹی کے 3 فی صد کو، اور ایک چوتھائی رقم صرف ایک فی صد لوگوں کو ادا کی گئی۔ امریکہ کے سب سے خوش قسمت ''کاشت کار'' کو 2002ء میں 70 لاکھ ڈالر ملے، اور جارجیا میں سات ''کاشت کاروں'' کو سالانہ دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رعایتیں دی گئیں! طاقتور لابی

Marfat.com

کاروں کی وجہ سے بقا کی جدوجہد کرنے والے کاشت کار گھرانوں کی مدد کا نظریہ فراموش کر دیا گیا ہے۔ امریکی محکمۂ زراعت نے جون 2005ء کو جاری کی گئی رپورٹ میں تخمینہ دیا ہے کہ صرف 25 فی صد کاشت کاروں کو امدادی رقوم حاصل ہوئی ہیں۔

اس ناقابلِ یقین عدم مساوات سے قطعِ نظر امریکی رعایتوں نے ترقی پذیر ملکوں میں شدید پریشانی ابھاری ہے۔ دی کارٹر سینٹر کا معاشی ترقی میں امداد کا ایک بڑا پروجیکٹ عمل میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ملایا کے تین چوتھائی لوگ ایک ڈالر سے بھی کم پر گزارا کرتے ہیں، جبکہ 90 فی صد سے زیادہ لوگ دو ڈالر سے کم پر گذر بسر کرتے ہیں۔ اس کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں سے ایک چوتھائی کا انحصار براہِ راست کپاس پر ہے اور ان میں سے خوش قسمت گھرانے پانچ ایکڑ سے 280 ڈالر کماتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کے بہتر ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے ملک کی اپنے کپاس کے کاشت کاروں کو دی جانے والی رعایتیں ہیں جن کی وجہ سے بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ کپاس کی عالمی قیمت ملایا کی کپاس کی پیداواری لاگت سے بھی کم ہو گئی۔ بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے بتاتا چلوں کہ امریکہ صرف اپنے کپاس کے کاشت کاروں کو جتنی رعایت دیتا ہے، وہ ملایا کی مجموعی قومی آمدنی کے برابر اور نیم صحارائی افریقی ملکوں کو دی جانے والی امریکی امداد سے دگنی ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) ہماری کپاس کے کاشت کاروں کو دی جانے والی رعایتوں کو غیر قانونی قرار دے چکی ہے۔ چنانچہ بنیادی طور پر امیر کاشت کاروں کے لیے فائدہ بخش اس پروگرام میں اصلاح کی جانی چاہیے۔

اس قسم کی بنیادی سیاسی اور معاشی پالیسیوں کی وضاحت بلکہ ان پر یقین کرنا بھی مشکل ہے، اور یہ امریکہ کی سیاسی اور مذہبی اخلاقی اقدار پر براہِ راست حملہ ہیں۔

Marfat.com

سپر پاور کسے کہتے ہیں؟

امریکیوں کو ہمیشہ اپنے وطن پر جائز فخر رہا ہے۔ ابتدا ہی میں ہمارے وطن کے بانیوں نے دلیرانہ اعلانِ آزادی اور اس اعلان کے ذریعے ہمیں فخر کرنے کے قابل بنا دیا تھا کہ ''تمام انسان برابر ہیں، ان کے خالق نے انہیں کچھ خاص حقوق عطا کیے ہیں، جن میں زندگی، آزادی اور خوشی کے حصول کے حقوق شامل ہیں۔'' اس وقت سے ہمارے عوام نے امریکہ کے عظیم فطری وسائل کو استعمال کیا ہے، انہیں گرم پانیوں تک رسائی حاصل ہے، نسبتاً دوست ہمسائے ہیں، ان کی ملک کی آبادی متنوع نسلوں والی آبادی ہے اور وہ ''ایک زیادہ کامل اتحاد'' تشکیل دینے کا قائدانہ جذبہ رکھتے ہیں۔

اب امریکہ کرۂ ارض کی تاریخ کے ہر دور سے زیادہ نمایاں فوجی قوت بن چکا ہے۔ جہاں گزشتہ بیس برسوں میں دنیا بھر میں ہتھیاروں پر خرچ میں کمی کا رجحان رونما ہوا ہے، وہاں امریکہ ہر سال اپنے فوجی بجٹ میں اضافہ کرتا آیا ہے۔ اب امریکہ کا فوجی بجٹ 4 کھرب ڈالر سالانہ سے تجاوز کر چکا ہے، جو کہ دنیا کے تمام ملکوں کے مجموعی فوجی بجٹ کے برابر ہے۔ امریکہ کے بعد سب سے بڑا فوجی بجٹ روس کا ہے۔ ہتھیاروں کی ایک دوڑ جاری ہے، جس میں ہمارا مقابلہ صرف اپنے آپ سے ہے۔ اس بہت بڑے فوجی بجٹ کی ایک وجہ یہ کہ ہمارے بیس ہزار فوجی سمندروں میں گشت کرنے والے بحری جہازوں پر متعین ہیں جبکہ دنیا کے 120 سے زیادہ ملکوں میں امریکہ کے تین لاکھ فوجی متعین ہیں، جبکہ 63 ملکوں میں امریکہ کے فوجی اڈے قائم ہیں۔ میری صدارت کا عہد پورا ہونے کے بعد سے امریکی صدر غیر ملکوں میں 50 مرتبہ فوجی مداخلت کر چکے ہیں۔ ہماری اپنی افواج کو ہتھیار فراہم کرنے کے علاوہ امریکہ اور ہمارے ناٹو اتحادیوں کے اسلحہ ساز ادارے بین الاقوامی مارکیٹ میں

Marfat.com

فروخت ہونے والے اسلحہ کا 80 فی صد تیار کرتے ہیں۔

یہ جاننا اچھا ہوگا کہ کسی روایتی حملے کے خلاف ہمارے ملک کا دفاع ناقابلِ شکست ہے اور یہ انتہائی ضروری ہے کہ امریکی دہشت گردوں سے درپیش خطروں کا سامنا کرنے کے لیے چوکس رہیں۔ تاہم جس طرح ایک انسان کے معاملے میں ہوتا ہے، کسی ملک کی قابلِ تعریف خصوصیات اس کی جسامت اور غیر معمولی طبیعی قوت نہیں ہوتیں۔ سوال یہ ہے کہ سپر پاور کی دوسری خصوصیات کون کون سی ہیں؟ میں پھر کہوں گا کہ یہ بھی وہی خصوصیات ہوتی ہیں جو کہ کسی فرد میں ہونی چاہئیں۔ ان خصوصیات میں شامل ہیں سچ، انصاف، امن، آزادی، عجز وانکسار، انسانی حقوق اور فیاضی وسخاوت سے واضح وابستگی اور دوسری اخلاقی اقدار کو قائم رکھنا۔

اس کی کوئی لازمی وجہ نہیں ہے کہ ہمارا ملک ان خصوصیات کے حوالے سے بین الاقوامی مثال نہ بن سکے۔ ہماری حکومت کو جھگڑوں کو جنگ کی بجائے پُر امن ذرائع سے حل کرنے کے حوالے سے معروف ہونا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی اس بے پناہ صلاحیت اور اثر ورسوخ کو اس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کا بے حد مشتاق ہونا چاہیے۔ ہمیں نہ صرف عالمی برادری بلکہ اپنے ملک کے شہریوں کی آزادی اور انسانی حقوق کے چیمپئن کے طور پر معروف ہونا چاہیے۔ امریکہ کو ایک ایسا مرکز بننا چاہیے جس کے گرد جمع ہو کر دنیا کے سارے ملک سلامتی اور ماحول کو لاحق خطرات سے لڑیں۔ ہمیں ضرورت مند لوگوں کو انسانی امداد مہیا کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی بے حساب دولت میں محروم لوگوں کو حصہ دار بنانے میں دوسرے صنعتی ملکوں کی قیادت کرنی چاہیے۔

ان سب مقاصد کے حصول کے لیے ہمارے عظیم ملک کو ہر ممکن طریقے سے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ جن میں بیشتر ایسے ہی بنیادی تصورات کو ماننے والے ملک ہیں۔ ہمیں نئی ہزاری میں اس اَمر کا عدیم النظیر موقعہ ملا ہے کہ ہم اپنے بے مثال اثر ورسوخ کو دانش مندی اور فیاضانہ جذبے کے ساتھ استعمال کریں۔

ان خصوصیات کو اپنانے کے لیے کوئی قربانی نہیں دینی پڑے گی۔ اس کی

Marfat.com

بجائے ہمارے ملک کو ماضی میں دنیا کی دوسری قوموں سے حاصل ہونے والے بھروسے، تعریف وتحسین اور دوستی کی بحالی سے ہماری اپنی ساکھ اور خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی تمام امریکیوں کو بھی متحد ہو کر مذہبی عقیدے کے احیا اور نشو ونما کے مشترک مقصد کے لیے جد وجہد کرنی چاہیے نیز ان تاریخی سیاسی اور اخلاقی اقدار کے احیا اور نشو ونما کے لیے، کہ جن کو ہم نے 230 سال پہلے وضع کیا تھا اور جن کے لیے ماضی میں ہم جد وجہد کرتے رہے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

امریکہ کا اخلاقی بحران

جمی کارٹر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کا دور انتہائی اہم اور تاریخ کے دھارے کو بدل دینے والی تبدیلیوں کا دور تھا مثلاً ایران میں انقلاب کا آنا اور افغان وار کا آغاز۔

وہ امریکہ اور باقی دنیا میں اپنے مذہبی رجحانات کے حوالے سے مشہور ہیں۔ انھوں نے عیسائی مذہب کے حوالے سے دو کتابیں Sources of Strength اور Living Faith لکھیں جو امریکہ میں بہت مقبول ہوئیں۔ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ان کی کتاب Blood of Abraham کے عنوان سے شائع ہوئی۔ صدارت کی مدت پوری کرنے کے بعد انہوں نے ''دی کارٹر سینٹر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لئے کام کر رہا ہے۔

جمی کارٹر کا تعلق امریکہ میں بنیاد پرست کہلوانے والے عیسائی فرقے سے ہے، تاہم انہوں نے اس کتاب میں اپنے آپ کو ایسے راسخ العقیدہ عیسائی کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا قائل ہے۔ انہوں نے امریکی سیاست میں بنیاد پرست اور انتہا پسند مذہبی گروپوں کے اثر و نفوذ امریکہ کی طرف سے بین الاقوامی معاہدوں کی پامالی اور تنازعات کو سفارت کاری کی بجائے اندھی طاقت سے نمٹانے کی ڈاکٹرائن جیسے حساس معاملات کا تجزیہ کیا ہے اور موجودہ امریکی طرز عمل کو بین الاقوامی اصولوں اور عیسائیت کے امن دوستی کے عقیدے سے متصادم قرار دیا ہے۔

انہوں نے امریکی ریاستوں میں پیدا ہونے والی خلیج کو بھی امریکی معاشرے کا ایک بڑا مسئلہ قرار دیا ہے نیز اسقاطِ حمل، گن کنٹرول، ہم جنس پرستی، نسلی امتیاز اور عورتوں کے حقوق کے حوالے سے امریکی قوم میں رونما ہونے والے سنگین اختلافات کا تجزیہ کیا ہے۔

یہ کتاب علم دوست افراد کے سامنے امریکی معاشرے کی ایک مصدقہ تصویر لائے گی اور وہ اسے مستند معلومات سے معمور ایک بے مثل دستاویز پائیں گے۔

Design By ریاض 0333-4349801

دارالشعور

37۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور
فون: 042-7239138,8460196
Email: m_d7868@yahoo.com

Marfat.com